وزیر آغا کی انشائیہ نگاری

مقالہ برائے ایم۔ فل

مقالہ نگار:
کہکشاں علوی

نگراں:
جناب الطاف حسین ندوی

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۹۹۵ء

تاریخ 24.4.1996

TO WHOM IT MAY CONCERN

This is to certify that the dissertation entiteled "Wazir Agha ki Inshaiya Nigari" by Mrs. Kahkashan Alavi is an Original research work done under my Supervision.

The dissertation is being submitted for the degree of M.Phil.

(Mr. Altaf Husain)
Supervisor

Conter Signature

(Prof. A.M.K. Shahryar)
Chairman

فہرست

پیش لفظ ۳

پہلا باب : انشائیہ کی تعریف اور فن ۶

دوسرا باب: وزیر آغا سے قبل انشائیہ نگاری کا ارتقاء ۲۶

تیسرا باب : وزیر آغا اور انشائیہ کی صنف ۷۱
(علمی اور تنقیدی مباحث)

چوتھا باب: وزیر آغا کی انشائیہ نگاری ۹۱
کا
تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ

کتابیات : ۱۱۵

پیش لفظ

پیش لفظ

زیر نظر مقالے کا موضوع "وزیر آغا کی انشائیہ نگاری" ہے۔ یوں تو ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت ہمہ جہت ہے انہوں نے اردو شاعری میں جدید نئے رجحانات دیئے وہیں اردو تنقید میں بھی بے پایاں مقبولیت حاصل کی ہے شاعری اور تنقید سے قطع نظر انہوں نے اردو انشائیہ نگاری کو نیا نکھار اچھوتے انشائیے بھی دیئے اور اس میدان میں بھی اپنی اہمیت تسلیم کرائی ہے۔

بہر حال ایم فل کے مقالے کے لیے میں نے "وزیر آغا کی انشائیہ نگاری" ــــــ منتخب کر کے اس کی تکمیل میں نے پوری محنت سے کی ہے ــــ

موضوع کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید سیدھا سادھا اور آسان موضوع ہے ایک طالب علم کی لیاقت اتنی نہیں ہوتی کہ اس دور وہ موضوع کی تہہ تک پہنچ سکے۔ کام کے دوران بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی دشواری مواد کی کمی تھی چونکہ وزیر آغا کے انشائیوں پر کام بہت کم ہوا ہے اس لیے میرے لیے یہ سوال بہت اہم تھا کہ میں اپنے کام کا آغاز کہاں سے کروں؟ انشائیہ کے سلسلے میں چند بنیادی کتابوں کو اپنے کام کا ماخذ قرار دینا پڑا۔ سید محمد حسنین کی کتاب "انشائیہ اور چند انشائیے"، آدم شیخ کی کتاب "انشائیہ" اور دوسری کتابوں کے مطالعے سے مجھے بہت مدد ملی۔ اس کے علاوہ وزیر آغا کے نظریات کا بھی مطالعہ کیا۔ ان سب مطالعوں کی روشنی میں نتائج نکالنے کی کوشش اس مقالے میں کی گئی ہے۔

حاصل شدہ مواد کو سامنے رکھ کر میں نے اپنے مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے ــــ

پہلا باب:۔ انشائیہ کی تعریف اور فن کا احاطہ کرتا ہے اس میں مختلف لوگوں نے انشائیہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کو سامنے رکھ کر انشائیہ کی تعریف کے سلسلے میں نتائج نکالنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے ساتھ اس مقالے میں اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ دوسری اصناف نثر کا بھی انشائیہ سے مقابلہ اور موازنہ کیا جائے اس لیے کہ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت تھی کہ کون کون سی اصناف انشائیہ سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور کون کون سی صنفیں انشائیہ سے مشابہ خصوصیات رکھتی ہیں ــــ

دوسرا باب:۔ وزیر آغا سے پہلے جن مصنفین نے مثلاً سرسید، محمد حسین آزاد، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری وغیرہ نے جو انشائیہ یا انشائیہ نما مقالے لکھے ہیں۔ ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وزیر آغا نے

انشائیہ میں کن جہتوں کا اضافہ کیا ہے۔

تیسرا باب: ۔ وزیر آغا کے خیالات انشائیہ نگاری کے بارے میں کیا رہے ہیں اور وہ انشائیہ کی تعریف اور اس کے حدود کس طرح متعین کرتے ہیں۔ ان کے خیالات اور دوسرے لوگوں کے خیالات کس حد تک مختلف یا ایک جیسے ہیں ۔

چوتھا باب: ۔ اس میں وزیر آغا کے انشائیوں کا انفرادی اور تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔ اس مقالہ میں وزیر آغا کے نمائندہ انشائیوں کو شامل کیا گیا ہے اور ان کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ اس مقالے میں کچھ خامیاں اور تشنگی کا احساس ہو سکتا ہے

مولانا آزاد لائبریری کے ضیاء الدین انصاری صاحب یا ساتھ ساتھ شمس النساء آپا کی پرخلوص معاونتوں کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ میں اپنے شعبہ کے ساتھی اسماء راشد اور ظفر امام کی بھی ممنون اور شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میرے کام سے دلچسپی لی

میں اپنے نگراں [illegible] [illegible] صاحب کی بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہر قدم پر میری رہبری کی پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کی بھی احسان مند ہوں کہ انہوں نے اپنی بے شمار مصروفیتوں کے باوجود مواد کی فراہمی اور مشکل وقتوں پر میرا ساتھ دیا۔

میرا فرض ہے کہ میں اپنے صدر شعبہ اردو پروفیسر ایم کے شہریار صاحب کا شکریہ ادا کروں ۔

خصوصیت سے میں اپنے والد ڈاکٹر سید محمد ضیاء الدین علوی مرحوم کی بے پناہ شفقت اور حوصلہ افزائی اور ان کے مشوروں کو الفاظ میں بیان کرنا ان کی محنتوں کو محدود کر دینے کے مترادف تصور کرتی ہوں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ عین اسی زمانے میں میرے سر سے ان کا سایہ اٹھ گیا جب میں اپنے کام کا آخری مرحلہ طے کر رہی تھی۔ بس اتنا ضرور کہوں گی ان کی یاد میرے لیے سب سے بڑا سرمایۂ حیات ہے ۔

کہکشاں [illegible] علوی

پہلا باب

انشائیہ کی تعریف اور فن

انشائیہ کی تعریف اور فن

انشائیہ اردو نثر کی اصناف میں ایک ایسی صنف ہے جسے ہم ایک تخلیقی صنف کا بھی نام دے سکتے ہیں۔ تخلیقی نثر کے نمونوں مثلاً افسانوی ادب خصوصی ناول اور افسانہ اور اس قسم کی اصناف کی تعریف اتنی واضح ہے کہ اس میں بہت زیادہ اختلاف کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، جبکہ انشائیہ کی تعریف کے سلسلے میں ابتدا سے ہی اختلاف رائے رہا ہے چنانچہ انشائیہ کی تعریف کے سلسلے میں کسی نے اسلوب پر زور دیا ہے کسی نے انشائیہ کے موضوع کو پیش نظر رکھا ہے تو کسی نے اس کے بعض دوسرے پہلوؤں پر نظر رکھی ہے۔ ویسے انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے اختصار، جامعیت اور عدم تکمیل کو زیادہ تر نقادوں نے غیر معمولی اہمیت دی ہے تاہم اس کی تعریف کے بارے میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں مسعود ہاشمی کا خیال ہے کہ

> "ادب کی ساری اصناف میں انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکی اس کی دو وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ انشائیہ حقیقت میں کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ انشائیہ کوئی باقاعدہ صنف نثر نہیں۔ انشائیہ نظم میں بھی لکھا جا سکتا ہے" [1]

انشائیہ کی تعریف اس کی اہم خصوصیات اور اس کے تکنیکی لوازم کے بارے میں جو باتیں سامنے آتی رہی ہیں ان کی بنا پر انشائیہ کی تعریف خالص علمی تعریف کے بجائے صرف تخلیقی تعریف بن کر رہ گئی ہے۔ یہ سوالات کہ انشائیہ مزاحیہ ہو یا طنزیہ ہو؟ اسے بنیادی طور پر سنجیدہ ہونا چاہیے یا غیر سنجیدہ؟ اس کا زندگی سے تعلق ہونا چاہیے یا نہیں ہونا چاہیے ہے اور اس طرح کے اور بہت سے سوالات ہیں جو دیگر اصناف ادب کے بارے میں بالعموم پیدا ہوتے ہیں لیکن ان سوالات کے بارے میں ابھی تک انشائیہ کے ضمن میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ انشائیہ نگار اس معاملہ میں اتنے حساس واقع ہوئے ہیں کہ وہ دوسروں کے انداز کو درست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس وجہ سے

---

[1] انشائیہ کیا ہے؟ سید مسعود ہاشمی

اچھے انشائیے ہمارے یہاں کم نظر آتے ہیں لیکن اس سے متعلق بحثیں زیادہ ہوئی ہیں
اسی صورت حال سے متاثر ہو کر احتشام حسین نے کہا تھا کہ

"گذشتہ چند سالوں سے اردو کے کچھ ادیب خاص طور سے انشائیہ کے حدود متعین کرنے کی کوشش میں ہیں ان میں بعض نے خود انشائیے لکھے ہیں اور گویا اس بات کا عملی نمونہ فراہم کیا ہے کہ ان کے خیال میں انشائیہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنے ذوق اور شعور کے مطابق انشائیہ لکھ رہے ہیں لیکن اس فکر میں نہیں ہیں کہ وہ انشائیہ کی تعریف کریں۔ یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جن کو آم کھانے سے کام ہے۔ گٹھلیاں گننے کا کام دوسروں کے سپرد کر دیا گیا ہے یا اگر ابتدا ہی کی زبان میں یہ کہا جائے ہیں۔
شعر میں کہتا ہوں سمجھے تم کرو"[1]

پروفیسر نظیر صدیقی کا شمار صرف نقادوں میں نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک اچھے انشائیہ نگار بھی ہیں مناسب ہوگا کہ اس موقع پر ان کی رائے بھی دیکھتے چلیں۔ انہوں نے اپنے انشائیوں کے مجموعے شہرت کی خاطر کے دیباچے میں انشائیے کی تعریف اس طرح کی ہے

"...... یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں جس میں عنوان کا مضمون سے مربوط ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا مضمون کا مضمون نگار سے مربوط ہونا ضروری ہے۔"[2]

اس رائے کے متوازی ڈاکٹر سید محمد حسنین کے خیال میں انشائیہ کا مطالبہ یہ ہے کہ

"انشائیہ ادب کی وہ کمین گاہ ہے جہاں قلم کار بیٹھ کر جس پر چاہے تیر چلا سکتا ہے۔ الزام و دشنام سے بے پروا ہو کر وہ ہر نام اور ہر کام کی منفعت اور خلفت کا محاسبہ کر سکتا ہے۔ ادب کا یہی وہ گوشہ ہے جہاں قلم کار کو ہر طرح کے بیان کی آزادی ہے"[3]

---

[1] انشائیہ اور انشائیے۔ سید محمد حسنین اسپیشل لکھا صفحہ ۸
[2] شہرت کی خاطر صفحہ ۱۰
[3] صنف انشائیہ اور انشائیے [illegible]

مندرجہ بالا تعریفوں سے کچھ ثابت ہو یا نہ ہو یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ انشائیہ کے مختلف اہم عناصر کیا ہیں اور انشائیے کے پیچھے کس طرح کے عوامل کام کرتے نظر آتے ہیں ۔

آئیے ہم دیکھیں گے کہ انشائیہ سے ماہرین کی مراد کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کی خصوصیات کیا ہیں اردو میں شاید سب سے پہلے اختر اورینوی نے انشائیہ پر غور و فکر کیا اور اس کے کچھ امتیازات کا تعین کیا ہمارے بعض نقاد نگار انشائیہ میں مزاح اور ظرافت کو پسند نہیں کرتے جبکہ اختر اورینوی کا کہنا ہے کہ

"انشائیوں میں مزاح کا عنصر بھی ضروری ہے ایک انشائیہ نگار مزاح کا ہر کس کا ہر بیرا استعمال کر سکتا ہے مگر سلیقہ شرط ہے مسلا مزاح لطیفے سے لے کر طنز تک کی یہاں گنجائش ہے اور مہنی مذاق. بول چال بھی سوانگ نکتہ گری اور ظرافت کی دوسری صورتوں کا برمحل استعمال انشائیوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ جملہ بازی اور فقرے کسنا یا کسی وقت سوجھ بوجھ کی کوئی بات کہہ دی یا کوئی چھپا ہوا ریمارک یا ہلکی سی چوٹ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے ظرافت کا استعمال ہر جگہ خوش مذاقی چاہتا ہے" [1]

پروفیسر کلیم الدین احمد کے ادبی قدر و قامت سے کون واقف نہیں انہوں نے بہت سی اصناف ادب کی تنقید لکھی اور ان کی ہر طرح کی تنقید کو اہمیت حاصل ہوئی ۔ وہ حسن عظیم آبادی کے انشائیوں کے مجموعے "نشاط خاطر" میں انشائیہ کے خد و خال اس طرح پیش کرتے ہیں : ۔

"خدا کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے کردار کے پوشیدہ سرچشموں کو پا لیتا ہے جس میں اس کی شخصیت کے متضاد عناصر ابھر آتے ہیں ۔۔۔۔۔ اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے ۔ کیونکہ اس کا مقصد یہی ہے کہ اپنی شخصیت کو پالے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے نہ جانے دے" [2]

انشائیہ کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے نثر کے ایک مخصوص اسلوب کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے وہ جس انشائیہ کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور

---

[1] ہر ہیم روز (اختر اورینوی)

[2] کلیم الدین احمد (نشاط خاطر کا پیش لفظ) صفحہ ۷

انشائیہ کو اسم بامسمیٰ ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ لکھتے ہیں: ۔

"انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسن انشاء ہے یہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے انشائیہ وہ ہے جس میں بجائے مغز مضمون کے اصل توجہ حسن عبارت پر ہو" [۱]

پروفیسر احتشام حسین نے انشائیہ کی جو اوصاف بیان کیے ہیں وہ اس طرح ہیں: ۔

"انشائیہ کو ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیئے جو پڑھنے والے کے ذہن پر منطق اور استدلال کے ذریعے نہیں بلکہ خوشگوار استعجاب اور بے تر تیب اور متفکرانہ انداز کے ذریعے اپنا تاثر قائم کرے" [۲]

ڈاکٹر آدم شیخ نے پروفیسر سید حسنین کی طرح انشائیہ کے موضوع پر باقاعدہ کتاب لکھی ہے اس لیے آدم شیخ یہ کوشش کرتے ہیں کہ انشائیہ نگاری کی تاریخ میں جو باتیں انشائیہ نگاروں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں ان باتوں کو انشائیہ کی تعریف کا حصہ بنایا جائے وہ لکھتے ہیں کہ: ۔

"انشائیہ ایک ذہین، رنگین مزاج، زندگی پسند اور روایت شکن فن کار کے جذبات و احساسات کا پرتو ہوتے ہیں۔ ایک انشائیہ میں لکھنے والے کے ان کے دبے ہوئے جذبات کا اظہار ہوتا ہے جس کی راہ میں اس کے عہد کی سماجی، مذہبی، اور اخلاقی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ انشائیہ نگار مروجہ اور فرسودہ روایتوں سے مانوس اور سطائف پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے انفرادی نظریات اور ذہنی کشمکش اظہار کے ذرائع ڈھونڈتی ہے ادیب اس اظہار کے لیے زبان اور تحریر کا سہارا لیتا ہے لیکن اصناف ادب میں بھی جو تحریریں انشائیہ نگار کے لیے اور مخصوص خیالات کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسے مواد ہیئت اور انداز بیان کی وجہ سے دوسری تحریروں سے منفرد ہوتی ہیں یہی انشائیے ہیں" [۳]

آدم شیخ کے برخلاف ڈاکٹر عبادت بریلوی نے انشائیہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے مضمون نگاری کا محض ایک منفرد و مخصوص انداز بتایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ: ۔

---

[۱] ماہنامہ ادیب (انشائیہ نمبر) صفحہ ۴

[۲] سید صفی مرتضیٰ (اردو انشائیہ کا تعارف) صفحہ ۷

[۳] انشائیہ۔ ڈاکٹر آدم شیخ صفحہ ۲۷

"انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے اس میں بعض ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کا ہر مضمون میں پایا جانا ضروری ہے۔ انشائیہ کا موضوع عام طور پر علمی اور تحقیقی نہیں ہوتا معلومات فراہم کرنا اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے اس کا تعلق عام زندگی سے ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کے تمام معاملات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان معاملات کے نشیب و فراز کی تصویر کشی کی جاتی ہے" [1]

مندرجہ بالا تعریفوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ مزاج کے اعتبار سے بہت لچکدار صنف ادب ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ میں تعدد موضوع اور وسعت پائی جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جن باتوں کو افسانہ، مضمون یا مقالہ میں کہنے کی گنجائش نہیں ہوتی ایسی باتوں کے لئے انشائیہ ایک ذریعہ اظہار بن گیا ہے اور اسی میں انشائیے کی تعریف بھی مضمر ہے۔ وحید الدین قریشی نے انشائیہ میں اظہار کی لچک اور آزادی کو اس طرح واضح کیا ہے۔

"انشائیے افسانے، ناول ڈرامے اور دیگر غیر صورتوں میں بھی لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جاتے رہے ہیں۔ ان کا رشتہ کبھی ناول سے کبھی ڈرامے سے اور کبھی افسانے سے جا ملتا ہے حالانکہ اپنے اپنے بنیادی رویے کی وجہ سے یہ نہ ڈرامہ ہے نہ افسانہ اور نہ ناول۔ صرف ان فارموں کو ایک جداگانہ قسم کے رویہ کے لئے اختیار کر کے انشائیہ نگار نے اپنی تخلیق پیش کی ہے" [2]

اس حقیقت سے کوئی بھی نقاد انکار نہیں کر سکتا کہ انشائیہ نگار چیزوں کو نئے تناظر میں دکھاتا ہے اور وہ کسی قاعدہ قانون کا پابند نہیں ہوتا۔

اسی لئے احمد ندیم قاسمی نے انشائیہ کی تعریف اس طرح سے کی ہے۔

"انشائیہ کسی خاص موضوع کے بارے میں ادیب کی سوچ کا عکس ہوتا ہے اس صنف کی کوئی متعین صورت نہیں۔ پیراگراف کا سلسلہ خیال دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے اس میں حکمت کی گہرائی اور زندگی کی شگفتگی، مسائل زندگی اور ساتھ ہی ہلکی پھلکی باتیں بھی کچھ ہوتی" [3]

---

1. اوراق (افسانہ انشائیہ نمبر)
2. " " "
3. بحوالہ انشائیہ کی بنیاد — سلیم اختر صفحہ ۱۹۶

احمد ندیم قاسمی اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے جن نکات کا اضافہ کرتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انشائیہ کی صنف کو کسی مخصوص ہیئت سے وابستہ کرنا مناسب نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انشائیہ کے بارے میں لوگوں نے عام اصناف سے بالکل الگ ہو کر سوچنا ضروری قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انشائیہ نگار کو ایسا مختلف ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے جس سے یہ تاثر ملے کہ وہ آدمی زندگی کو سر کے بل کھڑا ہو کر دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کا رویہ دوسروں کے نقطہ ہائے نظر سے قطعاً مختلف ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے برخلاف ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ نگار کے ذاتی زاویۂ نگاہ پر ہی اصرار کرتے ہیں

ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے انشائیہ کی پہچان یہ بتائی ہے کہ:۔

"انشائیہ سامنے کی چیزوں یا مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا نام ہے۔ اس کے لیے ماخوذہ چیزوں اور مناظر کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے تاکہ ان کے چھپے ہوئے پہلو نظر کے سامنے آجائیں یا پھر خود اپنی جگہ سے ہٹ کر ان چیزوں اور مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے" [1]

اس بات کو ڈاکٹر وزیر آغا نے کئی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً لڑکے کھیل کود کے دوران جھک کر جب ٹانگوں میں کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو انہیں ہر روز کا دیکھا بھالا منظر انوکھا اور نیا معلوم ہوتا ہے۔ دوسری مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ اگر ہم دریا کے ایک کنارے کو دیکھنے کے عادی ہیں اور ہر روز ایک ہی اکتا دینے والا منظر نظر آتا ہے تو ایک دن دریا کے دوسرے کنارے پر چلے جائیں پھر جو منظر ہم وہاں سے دیکھیں گے تو وہ ایک نیا اور دلفریب منظر ہوگا۔ اس بات کو بہت سے محقق نہیں سمجھ پاتے اور اسے ایک مہمل بات کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہر فن کار زندگی کو اپنے طور سے دیکھنے اور سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے وہ شاعر ہو یا افسانہ نگار ہو یا ناول نگار۔ تینوں فن کاروں پر ہر واقعہ تین طرح سے اثر انداز ہو سکتا ہے اور جب تینوں فن کار اپنی تخلیق پیش کریں گے تو تینوں کا پیش کرنے کا انداز بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔

اسی وجہ سے ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ اس تعریف سے انشائیہ کی

---

[1] سمندر اگر میرے اندر گرے ڈاکٹر وزیر آغا (پیش لفظ) صفحہ ۱۸

شناخت اور پرکھ میں بہت مدد مل سکتی ہے وہ کہتے ہیں کہ :۔

"انشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنفِ نثر ہے جو قاری کو بیک وقت فکری لطف اندوزی جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے" ۱؎

انشائیہ کا فن اور دوسری نثری اصناف

انشائیہ اردو نثر کی غیر افسانوی صنف ہے جس سے ایک طرف کہانی کا مزہ ملتا ہے تو دوسری طرف اس میں شعر کی لطافت بھی پائی جاتی ہے یہ صنف موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ایک مخصوص حیثیت کی مالک ہے۔ جس طرح داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ اردو نثر کی مخصوص اور منفرد اصناف ہیں اسی طرح انشائیہ بھی نثر کی ایک خاص قسم ہے۔ یہ مقالے کی طرح معلوماتی اور فکر انگیز نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں سوانح کی طرح شخصی اور تاریخی کارناموں پر زور دیا جاتا ہے۔ نثر کی اور دوسری اصناف مثلاً مراسلہ، مطائبہ، خاکہ اور رپورتاژ وغیرہ سے بھی الگ ہے۔ ان مذکورہ اصناف میں انشائیہ ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اردو نثر کی مختلف اصناف سے انشائیہ کی صنف کا مقابلہ اور موازنہ کرکے دیکھیں کہ کون کون سی اصناف انشائیہ سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں اور کن اصناف اور انشائیہ میں مشترک اور مشابہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

ادب کی نثری اصناف کے مقابلے میں انشائیہ مضمون نگاری یا مقالہ سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے لیکن اس قربت کے باوجود داستان، ناول، اور افسانہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اس کا مقابلہ مقالہ یا مضمون سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

۱؎ سمندر اگر مرے اندر گرے ڈاکٹر وزیر آغا (پیش لفظ) صفحہ 19

انشائیہ اور مضمون نگاری (یا مقالہ) :۔ مقالہ ہر چند کہ انشائیہ ہی کی طرح نثری ادب کی ایک صنف ہے مگر اس میں علمیت، متانت اور استدلالی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس میں کسی سنجیدہ موضوع یا خیال پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مقالہ نگار اپنے مقالے میں حکمت و فلسفہ یا علم و دانش کے کسی پہلو سے بحث کرتا ہے۔ مقالے کے اندر مقالہ نگار کو علمی اور سائنسی حقیقت کو زیر بحث لانا پڑتا ہے اور اپنے نقطہ نظر کو بہتر سے بہتر طریقے سے پیش کرنے کا پورا موقع ملتا ہے۔ ایک مقالہ نگار کے لئے تمام سنجیدہ پہلوؤں اور متعلقہ گوشوں اور مطلوبہ اغراض و مقاصد کا مکمل ادراک رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جب تک وہ اس کی مختلف جہات اور امکانات سے واقف نہیں ہوگا اس وقت تک معیاری اور کامیاب مقالہ نگار نہیں بن سکتا۔

مقالے کے مواد کی شگفتگی، اس کی ترتیب و تنظیم اور اس میں منطقی ربط کا ہونا بھی ایک عمدہ اور کامل مقالہ کی بنیادی شرائط میں داخل ہے۔ کوئی بھی اچھا مضمون نگار ان باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مقالہ خواہ کسی علمی اور ادبی موضوع پر ہو یا سائنسی موضوع پر اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ مقالہ نگار کو اپنے موضوع کے تعین کے وقت پہلے اس کا پورا خاکہ مرتب کرنا ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسے کن کن باتوں پر زور دینا ہے اور کن باتوں کو نظر انداز کرنا ہے۔ مقالہ میں جہاں بعض جزئی مسائل کو شامل کرنا ضروری ہوتا ہے وہیں بعض چیزوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

سیکولرزم (Secularism) کا تصور، مادی یا غیر مادی نظریہ حیات، تعلیمی زندگی، اشتراکی نظام میں خود کی آزادی یا اس قسم کی کوئی بات بھی مقالوں کا موضوع بن سکتی ہے۔ اسی طرح ادب، شاعری، اور تنقید اور دیگر فکری و ذہنی مسائل بھی مقالوں میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ کسی بھی مقالہ نگار کے لئے دو باتیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں ایک تو یہ کہ مقالہ نگار معلوماتی اعتبار سے اپنے موضوع پر حاوی ہو اور دوسرے یہ کہ وہ زبان و بیان پر بھی پوری قدرت رکھتا ہو۔ اگر مقالہ نگار کسی موضوع پر پوری گرفت رکھتا ہے اور وہ بات کی گہرائی تک رسائی رکھتا ہے تو اسے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور انہیں اپنے نقطہ نظر کا

جاذب بنانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ ایسا مقالہ نگار اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دے سکتا ہے
ایک اچھے مقالہ نگار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بات کو عام فہم زبان میں کہنے کا گُر جانتا ہے۔ مقالوں کی زبان کا
صاف اور رواں ہونا، بیان کا واضح ہونا اور اسلوب کا دلکش ہونا ضروری ہے۔ مقالہ نگار کا ایک
وصف یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ ہوش مند ہو۔ بعض مقالات خشک موضوعات پر ہوتے ہیں اور ان کا پس منظر
خشک اور غیر دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اب یہ مقالہ لکھنے والے کا فرض ہے کہ وہ اپنے اسلوب بیان اور طرز ادا
سے ان باتوں کو گوارہ اور قابل قبول بنادے۔ کبھی کبھی اس مقصد کے حصول کے لیے اس کو تمثیلی
اور مجازی انداز بیان بھی اختیار کرنا پڑتا ہے ـــ

انشائیے اور مقالے کے مشترک عناصر : کسی بھی مقالے کی بنیادی خصوصیت اس کی سنجیدگی تصور کی جاتی ہے۔ مقالہ نگار
کسی موضوع پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے اور اس پر اس طرح سے اظہار خیال کرتا ہے
کہ موضوع کی ہر بات مکمل اور واضح طور سے قاری کے سامنے آجاتی ہے اور اس طرح ہم کو
موضوع کے بارے میں مطلوبہ واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ایک انشائیہ نگار بھی اپنے موضوع پر مقالہ نگار ہی کی طرح روشنی ڈالتا ہے
لیکن مقالہ نگار اور انشائیہ نگار کے رویے میں نمایاں فرق ہے۔ مقالہ نگار موضوع کے
اس پہلو کو واضح کرتا ہے جو واضح نہیں ہے یا ایسی جہت کو نمایاں کرتا ہے جو بظاہر
قاری کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے وہ اپنے ادبی مزاج اور زبان دانی کی آزمائش سے عام فہم
زبان میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مقالہ نگار کے برخلاف انشائیہ نگار
کی کوشش اس سے مختلف ہوتی ہے وہ قاری کی توجہ کسی ایک سمت نہیں لے جاتا
بلکہ وہ حظ کا پہلو بھی اس میں لے آتا ہے۔ مقالہ پڑھنے کے بعد ہماری علمیت میں اضافہ
ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انشائیہ نگار لمحہ بھر کے اندر ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے
جہاں سنجیدگی سے زیادہ دلکشی اور ظرافت ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ

ہمیں حیوان ظریف بنا دیتا ہے۔ انشائیوں کے مطالعے سے ہمیں زندگی زیادہ رنگین اور زیادہ خوشگوار دکھائی دینے لگتی ہے اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ ہمیں غیر ضروری سنجیدگی سے دور لے جاکر قدرے غیر سنجیدہ بنا تا ہے۔

مقالوں کی سنجیدگی اور خشکی سے جو بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے انشائیہ اس بے رنگی اور بوریت کو دور کر سکتا ہے مقالے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور انشائیہ سے تاثرات میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ مقالے کا کام اگر فکر جزی ہے تو انشائیہ کا کام کیف آوری ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے قول کے مطابق انشائیہ کا مقصد ذہنی تازگی ہوتا ہے۔

مقالہ نگار کی باتیں عالمانہ ہوتی ہیں۔ وہ بات کو سنجیدگی سے کہتا ہے وہ متانت اور بردباری کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا۔ وہ الفاظ کے استعمال میں محتاط ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف انشائیہ نگار بات کو گھمانے پھرانے کا گر جانتا ہے اور لفاظی کو بھی کبھی سہارے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ انشائیہ نگار چاہتا ہے کہ جتنی بات اس کو معلوم ہے وہ اس سے قاری کو اتنا متاثر اور محظوظ کر دے کہ باتوں کا لطف دوبالا ہو جائے۔ اس اسلوب کی وجہ سے قاری میں خوش فکری و خوش گفتاری آتی ہے اور وہ خوش فکری قاری کے ادراک و فہم کو منجمد ہونے سے بچاتی ہے۔ اس طرح انشائیہ ایک ذہنی اور جذباتی تحریک کا سبب بھی بن جاتی ہے۔

انشائیہ اور رومانی نثر :- انشائیہ کو ادب لطیف یا رومانی نثر سے بھی جوڑا گیا ہے لیکن انشائیہ کو صرف رومانی نثر یا ادب لطیف کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ انشائیہ بظاہر ادب لطیف تو ہے لیکن ادب لطیف یا رومانی نثر کا اپنا ایک الگ اسلوب ہے۔ ادب لطیف اردو زبان و ادب کا وہ حصہ ہے جس میں علوم اور سائنس سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ رومانی نثر میں انسان کی ذہنی اور حسی کاوشوں سے سروکار ہوتا ہے۔ یہ وہ سرمایہ ہے جو مکمل طور پر محسوسات اور مشاہدات کا منبع ہوتا ہے۔ رومانی نثر میں گہری سنجیدگی بھی نہیں ملتی اور نہ ہی مضمون کی خشکی پائی جاتی ہے۔ رومانی نثر میں نرم انداز کو اپنایا جاتا ہے جو پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرائے۔

اس میں پڑھنے والے سے سنجیدگی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ رومانی نثر کو زبان و ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

ادب لطیف یا رومانی نثر صرف تخلیق کا نام نہیں بلکہ ایک خاص قسم کی تحریک کا نام ہے جو تحریک اردو میں بیسویں صدی کے اوائل میں سجاد حیدر یلدرم، ناصر علی، مہدی افادی اور سلطان حیدر جوش وغیرہ کے ہاتھوں فن کے معراج پر پہنچی تھی۔ اس کے اپنے کچھ اصول تھے۔

یہ ادب لطیف ایک زمانے میں بیانیہ یا شگفتہ کے نام سے موسوم تھا اس زمانے میں اس طرح کی تحریریں بڑی اہمیت رکھتی تھیں جن میں سیدھے سادے اصلی اور دردانگیز کیفیت کی ترجمانی ہوتی تھی ایسی تحریریں لذت انگیز ابہام کا پیکر، موزوں خیال کی حامل تھیں۔ یہ منتوع رنگ اور تمام تحریریں اگرچہ ایک منفرد شکل اور ساخت کی حامل تھیں مگر ان تحریروں کو دائمی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ وہ ایک خاص زمانے سے وابستہ تھیں اور ان تحریروں کی اہمیت بھی مزاجی سیاق و سباق میں ہی سمجھی جاتی تھی۔

انشائیہ نگار کا تعلق سنجیدگی سے نہیں بلکہ بذلہ سنجی اور ادبی لطائف سے ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کی زبان و بیان مفکر اور سائنس داں کی طرح نہیں ہوتی۔ اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ میں سنجیدگی نہیں ہوتی۔

انشائیہ نگار ادب کے ہر شعبے اور زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات کو پیش کر سکتا ہے اس میں فن کار کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو جس طرح چاہے پیش کر دے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انشائیہ اور رومانی نثر میں تخیل کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ہے اور یہی وہ قدر مشترک ہے جو ادب لطیف اور انشائیہ میں برابری کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

انشائیہ اور دروں بینی :- انشائیہ نگار دراصل داخلی دنیا کا ترجمان ہوتا ہے۔ اپنے کام کو انجام دینے کے لئے وہ صرف اپنے دل کی گہرائیوں میں نہیں جھانکتا بلکہ دوسروں کے دل و دماغ کو بھی پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی داخلیت کا ادراک انشائیہ نگار

اپنے ذاتی مشاہدات کے وسیلے سے ہی کرتا ہے۔ انشائیہ اور کیفیہ دونوں ہی تاثراتی تحریریں ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ کیفیہ میں ایک ہی نہج ہوتی ہے جبکہ انشائیہ ہمہ جہت اور پہلودار ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ ایک طرح سے مسجع سطوری نثری غزل ہے اور وہ بھی ایسی غزل جس کا ہر شعر ایک نئے معنی سرور اور سکون بخشتا ہو۔ انشائیہ کی دروں بینی حرف دل کو ترو تازہ نہیں کرتی بلکہ دماغ کو پرکیف بھی بناتی ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنی واردات قلب سے کہیں زیادہ اپنے ذہنی تاثرات کا جادو جگاتا ہے۔

H. Hudson اسی لئے انشائیے کو بالکل ذاتی نوعیت کی تحریر قرار دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس صنف کو مغربی ادب میں پرسنل ایسے (Personal Essay) یا نجی نگارش کا بھی نام دیا گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی انفرادیت کی عکاسی انشائیے سے بہتر کسی اور صنف میں ممکن نہیں خواہ وہ شاعری کی صنف ہو یا نثر کی۔ انشائیے میں انشائیہ نگار اپنی ادبی شخصیت کی پوری عکاسی کر سکتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے قلم کے جادو اور شگفتہ بیانی سے اپنے قاری کو ایک ایسے عالم میں لے جاتا ہے جہاں قاری سب کچھ بھول کر اس میں کھو جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تحریریں کسی بھی انشائیہ نگار کی شخصیت کی عکاسی کرنے والی بے مثال تحریر ہے۔ اپنی اس منفرد خصوصیت کی بنا پر انشائیے کے حدود خالص مقالہ سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ مکالمہ بنیادی طور پر ڈرامائی نثر کا حصہ ہوتا ہے کہ انشائیہ چونکہ داخلی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اور مکالمہ یا کسی کی گفتگو یا عمل کی نقل اس لئے دونوں کی حدیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔

انشائیہ اور خبر نگاری :- عام طور پر کسی بھی تحریر کا موضوع پہلے متعین ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دائرہ کار کا بھی تعین ہوتا ہے مگر انشائیہ کسی ایک موضوع کا پابند نہیں ہوتا یہ منفرد خوبی ہی انشائیہ کی خصوصیت ہے۔ انشائیہ نگار روزمرہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سی معمولی کیفیت کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے وہ اپنی طبیعت کی دل آویزی اور

شگفتہ بیانی سے بات میں بات پیدا کر سکتا ہے۔ یوں تو بات میں بات پیدا کر دینا ایک صحافی کے لیے بھی دشوار نہیں ہے لیکن صحافی کی تحریر کی بنیاد کسی واقعہ پر ہوتی ہے وہ انشائیہ نگار کی طرح آزاد نہیں ہوتا ویسے تو بات میں بات پیدا کرنا صحافی کا وصف ہے۔ اسی طرح انشائیہ نگار کی طرح صحافی بھی خبروں کے بجائے مضمون میں کچھ آزاد ہو جاتا ہے لیکن دونوں کے طریق کار میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار کی تحریروں میں کسی پالیسی یا مقصد کی چھاپ نہیں ہوتی جبکہ صحافی کسی نہ کسی نصب العین سے تعلق رکھتا ہے۔ خبر نگار اپنے قلم کے سحر نگاری سے روزناموں اور ماہناموں کے قارئین کو اپنا ہم خیال بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی میں صحافی کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اس کے برخلاف انشائیہ نگار آزاد اور خود مختار ہوتا ہے اور وہ کسی پالیسی کا پابند نہیں ہوتا۔

صحافی کے یہاں باتوں میں سنجیدگی ہوتی ہے مگر یہ باتیں وقتی ہوتی ہیں۔ اس میں مقالہ کی طرح گہرائی اور گیرائی نہیں ہوتی۔

جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا کہ انشائیہ نگار ہر موضوع پر قلم اٹھا سکتا ہے۔ اس کے موضوعات میں وسعت ہوتی ہے اور اس کے دل و دماغ پر کسی قسم کی چھاپ نہیں ہوتی۔ ایک اچھے انشائیہ نگار کا ذہن سیال پانی کی طرح متحرک اور بیدار ہوتا ہے جو ہر وقت رواں دواں رہتا ہے۔

صحافی بھی مقالہ نگار کی طرح فکر کی دعوت دیتا ہے لیکن صحافی کی باتوں میں کوئی مقصد یا نصب العین ضرور پوشیدہ ہوتا ہے صحافی کسی نہ کسی مقصد کو لے کر ہی قلم اٹھاتا ہے اس کے برخلاف مقالہ نگار سچائی اور دیانت سے کام لیتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انشائیہ نگار کا لہجہ سوالیہ نہیں ہوتا یہی اسباب ہیں کہ انشائیہ ہمیں آسودگی بخشتا ہے اور فرحت و تازگی سے ہمکنار کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کائنات کی کسی چھوٹی سی چھوٹی بات سے متاثر ہو کر اس پر قلم اٹھا سکتا ہے اور کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ انشائیہ کے لیے اگر کوئی شرط ہے تو یہ کہ اس کے محسوسات اور جذبات دل کو چھو لینے والے ہوں۔ اگر انشائیہ نگار میں کیف اور اثر نہیں تو پھر اس سے ایک اچھا انشائیہ نہیں لکھا جا سکتا انشائیہ ہم کو تازگی دیتا ہے وہ ہمارے فکر میں مخمصے نہیں لگواتا۔ انشائیہ نگار کا کام دل بہلانا ہے

نہ کہ کوئی لطف دینا۔ اس کا انداز بیان خوش گفتاری کا ہوتا ہے وہ سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ کر سکتا ہے اور غیر سنجیدہ بات میں بھی دلچسپی کا عنصر شامل کر سکتا ہے۔ معمولی کو غیر معمولی کر دینا اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا ہی انشائیہ نگار کی جادو بیانی کا کمال ہوتا ہے۔ وہ پارلیامنٹ کو اوپر کے کھیت سے تشبیہ دے سکتا ہے اور کتوں کی چیخ پکار میں بھی غزل کے مصرعوں کا آہنگ تلاش کر سکتا ہے۔

انشائیہ اور کہانی :- انشائیہ نگار اور کہانی کار میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے اس کا کام افسانہ نگاری نہیں ہے۔ ویسے کچھ انشائیہ نگاروں کا نظریہ بھی رہا ہے کہ انشائیے میں پر لطف واقعہ یا قصہ کا ہونا ضروری ہے۔ جدید دور میں انشائیے کے من میں کہانی بیان کرنے کو بنیادی حیثیت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ یوں تو ضمناً کوئی کہانی انشائیے میں بیان ہو سکتی ہے مگر انشائیے کو ہم کہانی کا بدل نہیں بنا سکتے اور انشائیہ کو کہانی کی صف میں لایا جا سکتا۔ قصہ کہانی اور واقعہ سازی کے لئے اردو ادب میں مختلف اصناف ہیں مثلاً داستان یا ناول یا افسانہ اور مثنوی وغیرہ۔ ان میں قصہ بیان کرنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں اور ان اصناف کی بنیاد بھی افسانوی ادب کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ان میں فنی ضوابط کی پابندی اور روایت کی پاسداری کے لئے چند اجزا کا استعمال ناگزیر ہے۔ اصطلاح میں یہ اجزائے ترکیبی پلاٹ، واقعہ اور کردار وغیرہ کہے جا سکتے ہیں ہر کہانی میں ان کا استعمال لازمی ہے۔

اس کے برعکس انشائیے کے لئے جو عنصر ضروری ہے وہ تاثرات ہیں اور تاثرات بھی ایسے جو بہت زیادہ منظم صورت میں نہ ہوں۔ انشائیے میں ذاتی قسم کے منتشر خیالات اور تاثرات بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ خیالات کی بے ربطی اور بے ترتیبی خیال دوسری نثری اصناف کا عیب ہے وہیں یہ بات انشائیہ کا حسن ہے۔ انشائیے میں قصہ یا واقعہ کی ذرا سی آمیزش سے واقعیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے مگر یہی رنگ انشائیے کو اپنے مقصد سے دور لے جاتا ہے۔

انشائیے کی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت انتشار خیال یا ذہنی آوارگی ہے۔ اس کے

برخلاف کہانی کی کامیابی قصہ، پلاٹ اور کردار نگاری ہے۔ ایک طرف انشائیے میں تاثرات کی بوقلمونی نظر آتی ہے تو دوسری طرف کہانی میں واقعات کے پیچ و خم اور نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ واقعات خواہ کتنے ہی مختصر انداز میں کیوں نہ بیان کیے جائیں ان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جزئیات بھی ہوتے ہیں جن کو ادب میں جزوی اہمیت حاصل ہے۔ ان کو ادب میں جزئیات نگاری کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ انشائیے میں جزئیات کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلم ہے انشائیے میں جزئیات کے مناسب اور برمحل استعمال سے رنگارنگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جزئیات کی طرف توجہ دینے سے انشائیے میں رونق نکھار اور اچھوتا پن آجاتا ہے۔ ایک کامیاب انشائیہ نگار وہ ہے جو چٹکلوں، برجستہ اشعار اور قول محال سے کام لے۔ اس سے انشائیے کی بوقلمونی اور تنوع بھی برقرار رہتی ہے اور لطف بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔

انشائیہ دراصل ذہنی افتاد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انشائیے میں کسی بنیادی خیال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دراصل انشائیے کی کامیابی کا انحصار ایسے تاثرات ہوتے ہیں جو بالکل نئے اور اچھوتے ہوں خواہ اس کو کسی بنیادی اور مرکزی خیال کے حوالے سے پیش کیا گیا ہو یا آزادانہ طور پر۔

انشائیہ اور طنز و ظرافت :- انشائیہ اور ظرافت میں بظاہر بہت زیادہ دوری نظر آتی ہے سمت اور موضوع کے اعتبار سے کسی خاص رویے ادب یا رنگ کو پیش کرنا الگ ہے اور اپنے موضوع میں کوئی خاص رنگ بھر دینا بالکل الگ چیز ہے۔ اس لیے ادبی تحریروں کو ہمیں صرف اور ان کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور ادب پارہ یا اصناف سمجھ کر اسے جانچنا اور پرکھنا چاہیے ادب میں طنز و مزاح اور ظرافت دراصل ادیب طبع کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انشائیے میں طنز و ظرافت کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن ظریفانہ انداز اپنائے ہوئے ایک کامیاب انشائیہ نہیں لکھا جا سکتا۔ اس لیے کہ انشائیہ میں انشائیہ نگار کی شخصیت، تاثرات اور اس کا فن سبھی مضمر ہوتے ہیں۔

اگر انشائیے میں مزاح پیدا کیا جائے تو اس کی دو قسمیں ہیں ظرافت اور ہجو۔ یہ دونوں

انشائیے کے دو سمت اہم لوازمات ہیں۔ ظریفانہ انداز کے انشائیے میں انشائیہ نگار کو ہنسنے اور ہنسانے کے بہترین مواقع ملتے ہیں۔ دوسروں پر ہنسنا آسان کام ہے مگر اپنے اوپر دوسروں کو ہنسانا بہت مشکل عمل ہے اس کے لیئے اخلاقی جرأت اور ضبط کی ضرورت ہوتی ہے انشائیہ میں انشائیہ نگار کی بیزرگی اور دوسروں کی حماقت اور اپنی حقیقت تمام چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک اچھے انشائیے سے ہمیں اصلی ہنسی کا لطف آ سکتا ہے، کھسیانی ہنسی کا نہیں۔ ظرافت سے انشائیے میں ایسی تازگی آجاتی ہے کہ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اصلی اور معیاری مزاح محض بے ربط خیالات سے نہیں بلکہ شعوری طور پر خیال کو الٹ پلٹ کرنے سے ابھرتا ہے۔ انشائیہ لمحہ بھر کے لیئے ہمیں حیوان ضاحک بنا دیتا ہے۔ ظرافت کے لیئے لطافت اور شائستگی ضروری ہے۔ اچھے انشائیوں میں مزاح بہت ہلکا پھلکا ہوتا ہے اور ان میں ظرافت کا رنگ بھی شامل ہوتا ہے۔

ایک اچھا انشائیہ نگار خود کچھ نہیں کہتا بلکہ دوسروں کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کا گر جانتا ہے۔ انشائیہ نگار کو اپنی بات قاری تک پہنچانے کے لیئے تین چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیئے پہلے ہنسانا چاہیئں جن سے ہم کو دلی سکون اور آسودگی حاصل ہو دوسرے یہ کہ کبھی انشائیہ نگار کو طنز یہ استعارے بھی لکھنے چاہیئں جن سے کسی کی شخصیت بھی اجاگر ہو سکتی ہے تیسرے یہ کہ وہ خود بے حجاب ہو کر قاری کو محجوب و منفعل کرنے کی بھی صلاحیت کا اظہار کرسکے سید محمد حسنین انشائیہ کی یہ تین خوبیاں بتاتے ہیں [1]

ان مقاصد کے سلسلے میں حسنین صاحب کہتے ہیں کہ جس چیز سے انشائیہ نگار سب سے زیادہ کام لیتا ہے وہ ظرافت ہے۔ ظرافت سے انشائیے کے فنی تقاضے کسی حد تک پورے ہو جاتے ہیں۔ اس سے انشائیے میں ظرافت طرح طرح سے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ ظرافت سے کام لیکر انشائیہ نگار اپنی باتوں میں ایسا ناصحانہ رنگ بھی پیدا کر سکتا ہے جو نصیحت ہوتے ہوئے بھی نصیحت نہ معلوم ہو۔

انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں انشائیہ نگار کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔ انشائیہ نگار پر

---

[1] انشائیہ اور انشائیے۔ سید محمد حسنین صفحہ ۳۶

کوئی بندش نہیں ہوتی اور اس طرح انشائیہ نگار اپنی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اس سے ہی قاری حظ حاصل کرتا ہے۔

انشائیے میں جو تاثرات پیش کئے جاتے ہیں دراصل یہی تاثرات انشائیے کا کمال تصور کئے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف کسی اور صنف میں تلخ و ترش باتیں کہنے کی گنجائش نہیں ہوتی انشائیے کے لیئے سب سے اہم بات رجائیت ہے۔ انشائیہ میں ہنسنے ہنسانے اور انبساط حاصل کرنے کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ انشائیے کے لئے خوش فکری اور شگفتہ بیانی ایک اہم خوبی سمجھی جاتی ہے۔ انشائیہ نگار کے لیئے ضروری ہے کہ وہ ظریفانہ مزاج رکھتا ہو۔ ایک کامیاب انشائیہ نگار وہ ہے جو اصل کو نقل سے اور نقل کو اصل سے الگ کر سکے۔ اگر انشائیہ نگار اس منزل سے بخوبی گذر جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے انشائیہ کے فن کا حق ادا کیا۔

انشائیہ کے فن کی وسعت اور ہمہ جہتی :۔ انشائیہ یوں تو ایک مخصوص صنف نثر ہے مگر چونکہ انشائیہ کی اہم امتیازی اور منفرد خصوصیت اس کے اسلوب کی غیر یکسانیت ہے اس لیئے اس میں ایک طرح کی رنگا رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ انشائیے کے موضوع اور سبب کو نمایاں کرتی ہے۔ انشائیے کا کوئی بندھا ٹکا پیٹرن (Pattern) نہیں ہے۔ انشائیہ ہر طرح کی بندش سے آزاد ہوتا ہے۔ انشائیے کی اس صفت کو بعض لوگ غیر سالمیت کا نام دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جانسن نے اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے۔

"An irregular, undigested not Regular and orderly Performance" [1]

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلوب میں غیر سالمیت بہت اہم ہے اس طرح خیالات و تاثرات میں یک جہتی اور تسلسل نہیں رہتا۔ ایک معیاری انشائیے میں نیم فکری اور نیم تاثراتی باتیں بکھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور منتشر رہتی ہیں۔ اس طرح ان میں ایک قدرتی رنگ نظر آتا ہے ڈاکٹر جانسن نے اس کیفیت کو "Loose Sally of mind" کا نام دیا ہے اسی بات

---

[1] بحوالہ انشائیہ اور انشائیے سید محمد حسنین صفحہ ۳۹

بعض لوگ انشائیہ کے لیئے ترنگ کے لفظ کو بہت مناسب تصور کرتے ہیں۔

George Saint Bury نے اس ذہنی اور ادبی کیفیت کو ان الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"After Dinner Monologue of an interesting and well informed man" [1]

اس لیئے انشائیہ میں جو خوبصورتی ہے وہ اس کو دیگر اصناف سے الگ کرتی ہے۔ باتوں کا بے ترتیب ہونا، عدم سالمیت اور انتشار ہے اور یہی انشائیہ کی منفرد اور ممتاز خصوصیت ہے۔ عدم سالمیت کے تصور سے ہی اسلوب میں لچک، نرمی اور ناہمواری آتی ہے۔

انشائیہ نگار کے یہاں ہر طرح کے خیالات ہوتے ہیں۔ چھوٹے بڑے اچھے برے معمولی اور غیر معمولی کسی بھی طرح کے خیالات کے اظہار پر انشائیہ نگار کے لیئے کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اگر کوئی معمولی سی بات ہمارے ذہن میں آتی ہے جو ہمارے اوپر گہرے تاثرات چھوڑتی ہے اور اس چھوٹی سی بات میں بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو بظاہر کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ مگر یہی غیر اہم باتیں انشائیہ نگار کے لیئے بھی بہت اہم ہو جاتی ہیں۔ یہی باتیں انشائیہ نگار کو انشائیہ لکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس طرح انشائیہ نگار کے خیالات کی وحشت اور آوارہ گردی پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ انشائیہ ہی وہ صنف ہے جس کے ذریعہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا ہجوم جو ذہن کے گرد جمع ہے اس کو سلیقہ مندی سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ ذہنی انتشار کو طمانیت اور آسودگی میں بدل سکتا ہے۔

خیالات و افکار اور تاثرات کی جس ابتدائی خام اور نامکمل شکل کو انشائیہ نگار اپنے قلم کی طاقت سے پیش کرتا ہے وہی انشائیہ ہے۔

آج کے جدید زمانے میں انسان بری طرح ذہنی الجھن اور بے چینی میں مبتلا ہے یہی وجہ ہے کہ اس ذہنی کیفیت اور سماجی صورت حال سے انشائیہ نگار دوچار ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار ان سے آنکھیں نہیں چرا سکتا اور ان ذہنی بے چینیوں کے اظہار کے لیئے دوسری اصناف ادب

---

[1] بحوالہ انشائیہ اور انشائیے سید محمد حسنین صفحہ ۵۴

اپنی جگہ، مگر منتشر خیالات کو اپنے قالب میں ڈھالنے والی سب سے عمدہ اور مناسب صنف انشائیہ معلوم
ہوتی ہے ۔
کا ہونا بے حد ضروری ہے یہ وہ نثری اسلوب ہے جو قوت انشاء
انشائیے کی صف میں قوت انشاء کے زور و شور دونوں کا متحمل ہوتا ہے۔ انشائیے میں
انشاء دو دھاری تلوار کی طرح کام کرتی ہے۔ انشا ہموار خیالات کو ہموار اور وضع دار بناتی ہے
اور دوسری طرف ہمارے ذہن کو آسودگی بخشتی ہے انشاء کی مدد سے ہی ذہن کی آزادی ابھر کر
باتیں مناسب اور موزوں شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ انشائیہ کے لئے بے ترتیبی شرط ہے مگر انشائیہ نگار کے
لئے قوت انشاء سے کام لینا بہت ضروری ہوتا ہے ویسے بھی قوت انشاء کے ساتھ ساتھ بے ربط
خیالات بھی ایک خاص پیٹرن (Pattern) اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی بات انشائیہ کی امتیازی
خصوصیت کو قائم رکھتی ہے

ذہن میں آنے والے منتشر یا منظم خیالات کو خوش اسلوبی سے پیش کرنا
انشائیہ نگار کا فرض ہے اور انشائیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان میں تسلسل اور ربط قائم رکھے
خیالات میں سالمیت تو ہو مگر اس سالمیت کے ساتھ خیالات کی پیشکش میں آزادانہ
انداز اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر اس نظم و ضبط کو انشائیہ میں زیادہ برتا گیا تو اس بات کا
خطرہ لاحق ہوگا کہ وہ مقالے یا مضمون کی طرح مربوط اور منظم بن جائیں جو انشائیے کے تقاضے سے
الگ چیز ہے ۔

دوسرا باب

وزیر آغا سے قبل انشائیہ نگاری کا ارتقاء

عنوان	صفحہ نمبر
وزیر آغا سے قبل انشائیہ نگاری کا ارتقا	۲۸
سر سید احمد خاں	۳۰
محمد حسین آزاد	۳۲
مولوی ذکاء اللہ	۳۵
مولانا عبدالحلیم شرر	۳۶
رتن ناتھ سرشار	۳۸
سجاد حیدر یلدرم	۴۰
میر ناصر علی	۴۳
مہدی افادی	۴۵
سجاد انصاری	۴۷
خلیقی دہلوی	۵۱
خواجہ حسن نظامی	۵۴
فرحت اللہ بیگ	۵۶
مولانا ابوالکلام آزاد	۵۸
نیاز فتحپوری	۶۱
پطرس بخاری	۶۴
رشید احمد صدیقی	۶۵
کنہیا لال کپور	۶۷
مشتاق احمد یوسفی	۶۸

وزیر آغا سے قبل انشائیہ نگاری کا ارتقاء

پچھلے باب میں انشائیہ کی تعریف اور اس کے فن کے بارے میں ایک مفصل اور مدلل بحث کی جا چکی ہے۔ اب زیر نظر باب میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ انشائیہ نے کیسے ترقی کی اور بتدریج کس طرح زینہ بہ زینہ آگے بڑھی۔

جب ہم انشائیہ کی نشاندہی کرنا چاہیں گے تو سب سے پہلے ہماری نگاہ سر سید اور ماسٹر رام چندر کے مضامین کی طرف جائے گی۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو نثر کے اس دور میں مرزا غالب اور سر سید احمد خان کی تحریریں اردو نثر و شاعری کے سرمایہ میں اضافے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس دور میں سوائے سر سید کے اور کسی کے مضامین کو انشائیہ کے خانہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ مرزا غالب کے خطوط کا انداز انشائیہ سے بالکل مختلف ہے۔ جبکہ سر سید کے بعض مضامین میں منطق کے استعمال اور افکار کی آزادی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس طرح یہ مضامین انشائیہ کا نقطۂ آغاز کہے جا سکتے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کا خیال ہے کہ:-

> "ماسٹر رام چندر کو مضمون نگاری یا انشائیہ نگاری میں سب پر اولیت حاصل ہے۔ رام چندر نے اپنی مضمون نگاری کا آغاز فوائد الناظرین اور محب ہند سے ۱۸۴۷ء میں کیا جبکہ سر سید کے رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت ۱۸۷۰ء میں ہوئی۔" [1]

صدیق الرحمان قدوائی کی تالیف ماسٹر رام چندر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رام چندر نے خیر خواہ ہند کی پہلی اشاعت کے بعد اپنے پرچے کی اغراض و مقاصد کو بیان کرنے کے بعد یہ نوٹ بھی لکھا تھا کہ:-

> "یہ اردو کا ماہنامہ اگرچہ مرتبہ میں کم ہے لیکن انگریزی اور یورپی زبانوں کی طرز پر نکالا گیا ہے۔" [2]

---

[1] ماسٹر رام چندر اور اردو نثر میں ان کا حصہ۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر صفحہ ۳۱

[2] ماسٹر رام چندر۔ صدیق الرحمان قدوائی صفحہ ۱۱

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے جن شواہد کی بنا پر سید میر ماسٹر رام چندر کو زمانی ترجیح دی ہے وہ ناقابل تردید نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے بھی ماسٹر رام چندر کی اولیت تسلیم کیا ہے:-

"اردو نثر کی تاریخ میں رام چندر کی یہ تاریخی حیثیت بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اردو کو مضمون نویسی سے روشناس کرایا" [1]

صدیق الرحمان قدوائی نے ماسٹر رام چندر کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

"........ اب مغربی ادبیات سے استفادہ کا مضمون عام ہو گیا ہے اور زبان کے اسالیب، اصناف، خیالات اور اصطلاحات میں اضافہ ہوا۔ مضمون نگاری بھی اصناف میں سے ایک اہم صنف ادب ہے۔ رام چندر نے اردو میں پہلی بار اس کی طرف توجہ دی اور اسے اس خوبی کے ساتھ اس پیمانہ پر برتا کہ بہت جلد اسے عام مقبولیت حاصل ہوگئی۔" [2]

صدیق الرحمان قدوائی کے اس ترجیحی بیان کے باوجود جو بات ماسٹر رام چندر کی تحریروں میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں وہ شگفتگی نہیں ملتی جس پر آج کے انشائیے میں بہت زور دیا جاتا ہے اور انشائیے کے نقاد شگفتگی، سلاست اور زبان کے خوبصورت استعمال کو انشائیے کی بنیاد بتاتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف خود صدیق الرحمان قدوائی نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"رام چندر کا طرز تحریر اپنے دور کا سب سے اہم طرز ہے انشاء نگاری میں اس دور کی خوبیاں بھی اپنے ساتھ ہیں اور خامیاں بھی نظر آتی ہیں" [3]

ماسٹر رام چندر کے بارے میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ اردو کے پہلے مضمون نویس تصور ہو سکتے ہیں۔

---

[1] ماسٹر رام چندر۔ صدیق الرحمان قدوائی صفحہ ۱۴

[2] " " "

[3] " " صفحہ ۱۳۳

سر سید احمد خاں

سر سید وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس طرز نگارش کو پہلی بار اردو میں متعارف کرایا جس طرز نگارش کو انگریزی میں ایسّے کہا جاتا ہے۔ انہوں نے طبع زاد مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ ایسیز کے ترجمے بھی پیش کئے۔ اس لئے سر سید کی انشائیہ نگاری کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ سر سید نے یہ سارے انشائیہ نما مضامین تہذیب الاخلاق میں لکھے۔ تہذیب الاخلاق کے مقاصد میں انشائیہ نگاری اسٹیل ایڈیسن کی تقلید رکھی گئی ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سر سید انگریزی ایسیز سے بھی خوب اچھی طرح واقف تھے۔ اسی وجہ سے تہذیب الاخلاق میں جو اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کا ذکر ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سر سید نے ایڈیسن اور اسٹیل سے جو حصہ اثر قبول کیا تھا وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ۔

کسی شخص کو یہ خیال نہ آیا کہ کوئی ایسا پرچہ نکلے جو جلد از جلد ایک شائستہ معیار پر چھپا کرے اور غلط رایوں کو بتایا کرے اور لوگوں کو قومی بھلائی کی بڑی ترغیب دلاتا رہے۔[1]

چونکہ سر سید کی نگاہ سے صرف ایڈیسن اور اسٹیل کی تحریریں ہی نہیں گزری تھیں بلکہ انہوں نے انگریزی ایسیز کی تاریخ کا بھی اچھی طرح مطالعہ کیا تھا۔ تب سے سر سید نے بطور خاص ایڈیسن اور اسٹیل کو زیادہ پسند کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان رسالوں نے انگریزی معاشرہ کی خامیوں کو پیش کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا اور یہ سب سر سید کے اپنے اصلاحی نقطہ نظر کے مطابق تھا اور یہ سب برائیاں سر سید کو مسلم معاشرہ میں نظر آ رہی تھیں۔ چنانچہ سر سید لکھتے ہیں کہ۔

"غرض جو کچھ اس زمانہ میں فرنگستان میں تھا وہی کچھ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ اب ہندوستان میں موجود ہے اور اس لئے ایک ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کی یہاں ضرورت تھی مدعا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ اسی کے مانند تمام مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں جاری ہوا۔"[2]

---

[1] مقالات سر سید، حصہ ... مرتبہ مولانا اسمٰعیل پانی پتی صفحہ ۱۳

[2] ″ ″ ″ ″ صفحہ ۵۴

سر سید اردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے ادب برائے زندگی پر زیادہ زور دیا ہے۔ انہوں نے خود ادب کو زندگی کے لئے مفید سمجھا اس کا اظہار ان کی مقصدی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس انداز میں انہوں نے خود بھی لکھا اور اپنے رفقاء سے بھی کافی لکھوایا ہے۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں سر سید کی انشائیہ نگاری صرف خیالات کا آزادانہ اظہار نہیں بلکہ اس میں ہم کو اصلاح کا رنگ زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس لئے سر سید نے ذہنی، سماجی، علمی، ادبی اور اصلاحی مقاصد کے لئے انگریزی ادب کو زیادہ مفید سمجھا۔

اس خصوصیت کے باوجود سر سید کے فوائد و نقائص؟ انشائیہ میں کیا مقام رکھتا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ سر سید کے مضامین میں ظرافت کے کچھ انداز ضرور پائے جاتے ہیں مگر وہ پارگی جس سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہو بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ سر سید کے مضامین میں نصیحت کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔ دلچسپ مسائل کم نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین میں اسلوب نہ پایا جاتا ہے۔ تاہم سر سید اردو کے پہلے مضمون نگار مانے گئے ہیں۔ انہوں نے انگریزی مضامین سے اثر قبول کیا اور آنے والے مصنفین کے لئے نئی راہیں متعین کیں۔

سر سید نے کچھ انشائیے طبع زاد لکھے اور کچھ انشائیے انگریزی اسلوب کی بنا پر لکھے۔ مثلاً امید کی خوشی جو ایڈیسن کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جسے سر سید نے اپنی زبان میں لکھا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس کی وجہ سے وہ اپنے انشائیوں میں اپنی لطافت نہ لا سکے جو کہ انشائیہ کی شرط اولین ہے۔ اس لئے ان کے چند مضامین انشائیے میں پائے جاتے ہیں جو بعد کے چند لوگوں نے سر سید سے منسوب ہیں وہ اصلاحی اعتبار سے بہتر طور پر انشائیے کہے جا سکتے ہیں۔ چونکہ سر سید ایک مصلح قوم تھے۔ اس لئے ان کی انشائیہ نگاری میں بھی قوم کی خدمت کا انداز چھپا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بحث و تکرار، امید کی خوشی، خوشامد اور اپنی مدد آپ کو ناقدین نے بہترین انشائیے قرار دیا ہے۔

سر سید احمد خاں کا مقصد یوں تو انشائیہ لکھنا نہیں تھا مگر وہ اپنے اسلوب میں جس طرح کی شگفتگی پیدا کرنا چاہتے تھے اور جس طرح اپنے پیغام کو مسلم سماج کے لئے قابل قبول

بنانا چاہتے تھے۔ اس کا مثالی نمونہ سر سید کو انشائیہ کے انداز جیسا نظر آیا۔ چنانچہ انہوں نے امید کی خوشی جیسا مضمون لکھا۔ جو دلیپے لو انڈسن کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے لیکن سر سید نے اس کے خیالات کو بھی اردو انشائیہ کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ امید کی خوشی کے علاوہ بحث و تکرار، اپنی مدد آپ، خوشامد وغیرہ مضامین کو نہ صرف یہ کہ سر سید کے زمانہ کے ادبی معیار کے اعتبار سے بلکہ آج کے انشائیہ کے اصولوں کے مطابق بھی اچھے انشائیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد بلاشبہ اردو کے سب سے بڑے نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے کردار اور واقعہ کو زندہ کر کے پیش کر دینا محمد حسین آزاد کی نثر کا کمال ہے۔

آزاد نے انگریزی کے تراجم بھی کئے۔ اس کی بہترین مثال نیرنگ خیال ہے جو ۱۸۸۰ء میں چھپی۔

نیرنگ خیال کا انداز چونکہ انشائیہ تھا اس لیے اس کا طرز تحریر دوسری کتابوں سے جداگانہ ہے۔ نیرنگ خیال کی ہی وجہ سے محمد حسین آزاد کو انشائیہ نگار تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

اگرچہ مغربی مصنفین کے خیالات اور طرز تحریر سے متاثر ہونے والوں میں محمد حسین آزاد بھی شمار کئے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیف نیرنگ خیال کے دیباچے میں انگریزی خیالات کی نعمت کا اعتراف کیا ہے۔ مگر یہ صاف صاف نہیں کہا ہے کہ ان کے مضامین انگریزی مضامین

کا ترجمہ ہیں مگر بعد کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ نیرنگ خیال کے زیادہ تر مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ یا ان کا چربہ ہیں۔ مثلاً ان کا مضمون "گلشن امید کی بہار" ڈاکٹر جانسن کے مضمون The Garden of hope پر مبنی ہے۔ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" ایڈیسن کے مضمون "The end Eavour of mankind to get rid of their Burdem" پر مبنی ہے۔ جنت الحمقا Spectator کے مضمون Paradise of fools Pan Nell پر مبنی ہے۔

"شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" Tatler کے مضمون Vision of the tomple of fame پر مبنی ہے۔ البتہ اس میں مغربی مشاہیر کے بجائے مشرقی مشاہیر کا ذکر ہے۔ یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ جس نے عبارات ترجمہ کرنے کے لیے انگریزی کے ایسے مضامین کا انتخاب کیا جو اعجاز انداز کے تھے اور محمد حسین آزاد نے ایسے مضامین لیے کیونکہ جن میں تخیل کی جولانی اور صنعت کے اظہار وبیان کی لطافت اور دلکشی کا موقع مل سکتا تھا۔

ان کے مضامین میں انشائیہ کی تمام خوبیاں تو نہیں پائی جاتیں لیکن بیشتر مضامین میں انشائیے کی روح موجود ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر محمد صادق انہیں انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہوئے بھی تمثیلی انشائیہ نگار قرار دیتے ہیں۔

اختر سلیم تلہری نے بھی اسی بنا پر محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال کے مضامین کو انشائیہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف نیرنگ خیال کے مضامین "انشائیہ" کے تحت قطعی طور سے آتے ہیں۔ نیرنگ خیال کے مضامین کا انداز گنگا جمنی تمثیلی ہے اس مزے بیجانہ کے سلسلہ در سلسلہ تشبیہات کے تصورات کی زنجیر سمجھئے" [1]

اردو انشائیہ کی تاریخ میں محمد حسین آزاد کی اہمیت کے باعث مذکورہ بالا نقادوں نے جس طرح ان قدر و قیمت کو تسلیم کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد نے انشائیہ

---

[1] ادیب انشائیہ نمبر صفحہ ۸

استعاری کو تمثیلی سطح پر برتنے کی کوشش کی۔ ان کے مشہور انشائیہ "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ،" سیر زندگی اور خوش طبعی اور اسی طرح کے سارے انشائیے جو کسی جذبے یا کیفیت کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف آزاد کو انشائیہ نگار ثابت کرتے ہیں تو دوسری طرف ایک بے مثال مثل نگار کی حیثیت سے بھی پیش کرتے ہیں۔

محمد حسین آزاد نے انشائیوں کے علاوہ جو مضامین دوسرے موضوعات پر لکھے ہیں ان میں بھی انشائیوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ جو انشائیہ کی انفرادیت ہے۔ یہ مضامین گہرائی کو لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی تحریر میں خیال بہ خیال کی دلفریب جولانیاں ہیں۔ اس لیے ان کی تصنیفات کو کسی انشائیہ کی مثالوں سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ دنیا طرفہ جگہ ہے۔ چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس قدر عالم کو اس طرح کو اپنی زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں — انسان سے اکثر ایسا جرم ہو جاتا ہے کہ اگر جھوٹے لو ترپایا جاتا ہے، بازار میں لایا جاتا ہے کبھی ایام غریبی کر کے جاہلوں کو پھنسایا جاتا ہے کبھی لقمہ رزق کا پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت بڑے دغا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگ گئی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے حکمت ہی بن آتی ہے۔ غرض عیب کہ انسان بندوں کے حق میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کر راستی کے مراسلے میں پرچم ثابت قدم رہا ہے"[۱]

آزاد کے انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" کا بھی اقتباس ملاحظہ ہو:-

"جب تمام بنی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو سوال و جواب سے ابتک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے۔ مجھے ایک کبڑا دیکھ کر سمجھ کہ یہ شخص خالی ہے، چنانچہ اسی خیال سے بڑی طرف جھکے۔ ایک کو بڑی طرف آتے دیکھ کر ڈرے جو اس اثر سے گئے مگر انہوں نے جھٹ اپنا آئینہ میرے سامنے کیا مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے بدن اور قد و قامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا اور

---

۱ نیرنگ خیال۔ محمد حسین آزاد۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ، صفحہ ۱۰۳

اب آگیا کہ چہرہ کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا اور خاص خوش لیکن اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرہ کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ فقط اس کی ناک ہی سارے چہرے کے برابر تھی۔" [1]

مولوی ذکاء اللہ

سر سید اور محمد حسین آزاد کے علاوہ جن لوگوں کو انشائیہ نگاری کے ابتدائی دور کا معمار کہا جاتا ہے ان میں مولوی ذکاء اللہ کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے ایک مضمون "آگ" کو انشائیہ کی تاریخ میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ انشائیہ اپنے اسلوب بیان کے اعتبار سے ملا جلا ایک اچھا انشائیہ ہے۔ اس انشائیہ میں ذکاء اللہ نے انگریزی انشا کے طرز تحریر کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس انشائیہ کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زبان نہایت شگفتہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انشائیہ معلوماتی بھی ہے اور اس میں ذکاء اللہ کا مخصوص ناصحانہ رنگ بھی جھلکتا ہے۔ مگر انہوں نے جس طرح آگ کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور پیش کیا ہے اس سے انشائیہ کا مخصوص رنگ نمایاں ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:-

"آگ نامبارک اولاد ہے باد جنگل کی" "آگ ہماری دشمن جاں سوز بھی ہے
اور دوست دل افروز بھی"

اس طرح کے اور بھی فقروں سے یہ انشائیہ بھرا ہوا ہے۔

---

[1] نیرنگ خیال۔ محمد حسین آزاد "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" صفحہ ۶۲-۶۶

سرشار کے زمانے میں رومانی نثر کا جو رجحان بے حد نمایاں تھا۔ ان میں سرشار کا بہت بڑا حصہ ہے اور سرشار کے اسلوب کو بہت دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کے مضامین میں خیالات کی بلندی اور زبان کی دلکشی اپنی مثال آپ ہے۔ سرشار کی ناول نگاری کو اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کی انشائیہ نگاری پس پشت جا پڑی۔ اگر ان کو ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس فن میں بھی ان کی حیثیت مسلّم ہے۔ بیان قائم کرنے والوں میں سے ہے۔ یہی سرشار کی انفرادیت ہے اور انشائیہ نگاری کی حیثیت سے بھی ان کا امتیاز ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

سرشار کو ایک ناول نگار اور صحافی کی حیثیت سے جو امتیاز حاصل ہے وہ مزید وضاحت کا محتاج نہیں۔ لیکن سرشار نے بعض ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جن کو انشائیہ میں شمار کیا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر احراز نقوی نے اپنے ایک مضمون "سرشار بحیثیت انشائیہ نگار" میں لکھا ہے۔

> "اردو انشائیہ نویسی پر کسی نقاد اور محقق نے اپنی بحث میں غالباً سرشار کا ذکر نہیں کیا اور یہی سبب ہے کہ اردو انشائیوں پر تمام انتخابات ہو چکے ہیں مگر سرشار کا کوئی انشائیہ کسی بھی انتخاب میں نظر سے نہیں گذرا۔ دراصل وجہ اس کی یہی رہی ہے کہ سرشار کے انشائیوں کو دریافت ہی نہیں کیا گیا اور نہ

اس تصور کو روا رکھا گیا کہ سرشار انشائیہ نگار بھی ہو سکتے ہیں ۔

"سرشار بحیثیت انشائیہ نگار" یہ ذرا تحقیقی وجدان تھا جس میں پروف
اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا کہ سرشار نے لفظاً انشائیہ لکھے ہیں ۔ ذرا اندازہ ہے
کہ سرشار کے یہ تمام مضامین یکجا کئے جائیں تو مختلف نثری اصناف کا ایک
بڑا متنوع گلدستہ مرتب کیا جا سکتا ہے یہ تمام تحریریں سائنسی بہت
نثر ہی، بھاشنری علمی معلومات اور اعلیٰ موضوعات پر محیط ہیں ۔ اس
نثری سرمایے کو سامنے رکھ کر ہم اردو انشائیوں کا ایک خوبصورت
گلدستہ مرتب کر سکتے ہیں ۔[1]

ڈاکٹر احراز نقوی نے سرشار کی اس طرح کی تحریروں کا تجزیہ کر کے ان میں انشائیہ کے عناصر کی جستجو کی ہے ۔ سرشار کا مضمون "عشق" اور "بنی نوع انسان" مکمل انشائیہ کی جملہ خصوصیات رکھتے ہیں ۔ اگر سرشار کے مضمون عشق کو سامنے رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں انہوں نے تخیل کی پرکاری اور نازکی سہولت سے بھرپور انشائیہ بنا دیا ہے ۔ مثال کے طور پر "عشق" کے اس ٹکڑے کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ۔

"عشق کس کو کہتے ہیں اس کا حال کسی چوٹ کھائے ہوئے دل سے پوچھیے وہ دل جو مسلک عشق میں فنا ہو گیا ہو ۔ وہ دل جو عشق کے صدمے اٹھانے کا خوگر رکھتا ہو ۔ وہ دل جو عشق کی کڑی منزلوں میں تھک کے بیٹھ گیا ہو ، مگر ہمت نہ ہارا ہو ۔ وہ دل جو عشق کی بجلیاں چمک چمک کر گر کر جلائے جاتے قبرستان کا ڈھیر لگا دے اور جو اوصاف میں بڑا خوارزم ہو چکے تو سب کچھ سمجھے وہ دل حسن کی رنگینی اور تنعم کی خوگر ہو .... وہ دل حسن پرستی کا زخم کاری پڑا ہو ، وہ دل جو دامن دار کی لذت اٹھا کر ہیں زخم سے قاتل کو پکارے ، وہ دل جو کسی کے عشق کے دریائے ناپیدا کنار کے منجدھار میں ہو اور ناخدا سے جانیں

۱؎ نقوش شمارہ نمبر ۱۰۴

جس کا خدا ہی بیڑا پار کرے تو ہو[۱]

اس اقتباس میں دل اور عشق کے حوالے سے جو نئے پہلو پیدا کئے گئے ہیں ان سے سرشار کی تحریروں میں انشائیہ کے عناصر کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ گو سرشار باقاعدہ انشائیہ نگار نہیں مگر انشائیہ کی بازیافت میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سجاد حیدر یلدرم

سرسید اور محمد حسین آزاد کی اس روایت کو انہوں نے انگریزی ادب کی بنیاد پر انشائیے لکھے اور ان لوگوں کو انشائیہ نگار تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح سجاد حیدر یلدرم کا شمار بھی انشائیہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ یلدرم نے متعدد ناول، ڈرامے، افسانے اور انشائیے لکھے۔ مگر ان کی تحریروں کا دارومدار عموماً ترکی زبان کے ادب پر رہا۔ وہ ایک طرف ترکی زبان سے واقف تھے اور وہاں کی رومانی تحریروں کے شیدائی تھے تو دوسری طرف ان انشا پردازوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے جن کی تحریروں کو ادب لطیف کے نام سے موسوم کیا گیا۔ دراصل سرسید تحریک کے بعد اردو نثر میں مقصدیت کے خلاف جو ردعمل سامنے آیا اس کی نمائندگی یلدرم اور ان کے ساتھیوں نے کی۔ ان تمام لوگوں کی تحریروں کو ادب لطیف کا نام دیا گیا اور یلدرم کو اپنے تمام ساتھیوں میں پیش قدمی کا شرف حاصل ہوا۔ یلدرم کے انشائیوں کا مجموعہ خیالستان کو بڑی اہمیت دی

---

۱ بحوالہ انشائیہ کی بنیاد ۔ ڈاکٹر سلیم اختر ۔ صفحہ ۱۱۱

جاتی ہے۔ خیالستان کے علاوہ ان کے جو انشائیہ نما افسانے "چڑیا چڑے کی کہانی" "حضرت دل کی سوانح عمری" اور "غربت وطن" کو بڑی شہرت ملی۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ان کے انشائیوں پر ترکی زبان کے ادب پاروں کی گہری چھاپ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے اس بات کو خود تسلیم کیا ہے کہ ان کا انشائیہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے"۔ [1]

یلدرم کو ان کے افسانوں کی وجہ سے اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ اس ضمن میں اگر کسی کا نام آتا ہے تو وہ پریم چند ہیں لیکن پریم چند کے افسانوں اور یلدرم کے افسانوں میں بنیادی فرق یہی ہے کہ یلدرم کے افسانے بھی انشائیہ نما ہیں اور ان کے انشائیوں کا کیا کہنا۔ اسی لیے کہ وہ انشائیہ نگاری کی تاریخ میں تو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہی ہیں۔

اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ یلدرم اپنے مزاج اور رویہ کے اعتبار سے بھی اول و آخر ایک انشائیہ نگار تھے۔ ڈاکٹر معین الرحمان اور محمد حیات خان سیال نے بھی ان کے مجموعے خیالستان کو انشائیے اور افسانے کا مشترک مجموعہ تسلیم کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کا اسلوب آج کے زمانے میں لکھے جانے والے انشائیوں سے مختلف ہے اور جن خصوصیات کو انشائیہ کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے سلسلے میں اس انشائیہ میں تشنگی محسوس ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس انشائیے کو ایک طنزیہ مضمون کا نام بھی دیا جا سکتا ہے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:۔

"گویا اچھے انشائیہ میں طنز کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ محض ایک سہارے کا کام دیتا ہے"۔ [2]

سجاد حیدر یلدرم چونکہ ایک رومانی ناول نگار تھے اس لیے یہ رنگ ان کی تمام تحریروں پر اس طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے جیسے تمام تحریریں انشائیوں کے انداز میں

---

[1] خیالستان (مقدمہ) سجاد حیدر یلدرم

[2] خیال پارے۔ ڈاکٹر وزیر آغا "انشائیہ کیا ہے" صفحہ

لکھی گئی ہوں۔ ایک مکمل اور اچھے انشائیہ کے لیے شگفتگی اور تازگی لازمی شرطیں
ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نے انہیں چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انشائیہ تحریریں لکھیں۔

سجاد حیدر یلدرم کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے ان کے انشائیوں کے بعض نمونوں
کو اگر سامنے رکھا جائے تو آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو اس فن میں کس
حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ غربت وطن کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو

"غربت اچھی کہیں دنیا، یا آسمان، یہ سارا عیش نظم ہو رہی ہیں۔
میں وطن اچھا کہتا ہوں جو سب سے بڑھ کر عیش۔ جہاں کی گلیاں، بازار، جانی
پہچانی صورتیں سہانی لگتی ہیں، دکھ کی دوا ہیں
میں غربت میں تھی جس میں ہر تجربہ میرا، ہر بات نئی جو دو اتنی ملتی ہیں
گویا دو دریا ہیں کہ ملتے جدا جدا بہہ رہے تھے اب سنگم ہوا۔
میں غربت میں تھی جہاں دوست کا دستی اور آشنا صورت اعتبار
نہیں ہوتے جن کی ملاقات کر لی پڑے جہاں تجربہ عام کہہ کر چلتا
ہے کہ میں بے گھر ہوں اور دوست احباب میں تو شناسا بن کے
جدا ہوتا ہے" [1]

اسی طرح سے حضرت دل کی سوانح عمری کا یہ اقتباس بھی قابل غور ہے۔
"مجھ سے خواہش کی گئی کہ میں اپنی سوانح عمری لکھوں۔ اس میں
شک نہیں کہ میرے حالات عام لوگوں سے خالی نہ ہوں گے لیکن مشکل
یہ ہے کہ میری سوانح عمری، میری کیفیات، میری زندگی کی واردات
لوگوں کو بیان تو یقیناً نہیں ایسی کہ سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ حضرات ایک
چھوٹی سی بات سنیے میں اس زیر بحث ہوں۔ خدا نے بے شمار مخلوق
پیدا کی ہے اور اس بے شمار مخلوق میں میں ایک ناچیز مختصر سی
شے ہوں۔ لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کائنات

---

[1] خیالستان۔ سجاد حیدر یلدرم (غربت وطن) صفحہ ۱۸

انشائیہ نگار کی تقلید نہیں کرتے وہ جیسا اپنے آس پاس دیکھتے ہیں اور جیسا محسوس کرتے ہیں اسی کو انشائیہ کا رنگ دے کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ناصر علی کے انشائیوں میں ایک خاص چیز ایسی ہے جو بعض نقادوں کے نزدیک انشائیے کے فن کو مجروح کرتی ہے۔ وہ چیز نثری فقروں کے درمیان اشعار کی بہتات ہے۔ شعروں کی کثرت کی وجہ سے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ناصر علی کے اسلوب کا بہاؤ رک سا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ہم ان کے ایک انشائیے "چرخ شعبدہ باز" کا ایک اقتباس دیکھیں تو ان کے رنگ کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

"انسان کا سب سے بڑا تماشا چرخ شعبدہ باز کا نظارہ کرنا اور تماشت
کا تماشا ہے۔ میں اس کو تماشا اس لیے سمجھتا ہوں کہ اہل نظر کی نگاہ
میں کبھی یہ ایک نرما فروش ہے اور کبھی تماشہ گر خرام ناز سے پیدا ہونے منظروں
کے ہزار بار دکھاتی ہے"

تماشت کا خیال مجھے اس لیے زیادہ پسند ہے کہ اگر واقعی نہ ہو تو اس
کو غلط سمجھنے کی تہمت کیسے

لکھ گر فصل گل ہے اور تو ہو
ابھی کیا آپ میں آنے کے دن ہیں ؎

ناصر علی کے چند مشہور انشائیوں مثلاً مسکراہٹ، زندگی کی مشاعری، کہنی کے آنے کا انتظار اور ہماری بستی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ فنی طور پر انشائیہ کے عناصر کو انہوں نے بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ تاہم اشعار کی کثرت سے وہ تسلسل تقریباً ہر انشائیہ میں ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔

جہاں تک استعارہ کے استعمال کی بات ہے تو اس سلسلے میں اختصار کا

۱؎ بحوالہ انشائیہ۔ ڈاکٹر آدم شیخ صفحہ ۱۰۳

رویہ بعد کے انشائیہ نگاروں نے اپنایا ہے۔ ورنہ ناصر مسلی کے معاصرین میں اس
طرح کی مثالیں کئی جگہ ملتی ہیں۔

خلاصۂ گفتگو کے طور پر یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ زمانی تقدم کے باوجود ناصر مسلی
اس کارواں میں ایک ممتاز انشائیہ نگار نظر آتے ہیں۔ جس میں ادب لطیف کے
صف دوم کے نثر نگار شامل ہیں ——

مہدی افادی

یوں تو مہدی افادی کا شمار بھی ادب لطیف کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے لیکن مہدی
افادی اپنے اسلوب اور انداز بیان کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں علاحدہ ممتاز نظر آتے ہیں
انھوں نے انشائیے کم لکھے ہیں لیکن ان کے مضامین اور چند انشائیے جمالیاتی رنگ
میں نظر آتے ہیں۔ ان کے اس طرح کے مضامین کے مجموعے کا نام افادات مہدی ہے
انہی مضامین میں سے چند کو انشائیے کا نام دیا جاتا ہے مثلاً بنت عم، خواب طفلی
آرزوئے شباب اور حسن و عشق شامل ہیں۔

خواب طفلی اور آرزوئے شباب میں افادی نے جس بے باکی سے اپنے خیالات
کا اظہار کیا ہے وہ ان کی طبیعت کا وہ خاصہ ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے
افادی دوسرے معاصرین سے الگ اپنا خاص انداز رکھتے ہیں وہ کہیں کہیں عریانی کا بھی
سہارا لیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے مضامین میں کسی قسم کا مخاصمتی کا

ہوں کی کچھ چرائے چھپائے بجھی ہوئی آرہی ہیں۔ ذرا غور سے دیکھنا اندھیرے میں
بھی اس کا چہرہ کتنا چمک رہا ہے۔ یہ ہی جاگتی "زہرہ سمت" تمہارے
دل میں جگہ پائے گی۔ کچھ معلوم بھی ہے کون ہے؟ غور سے دیکھو وہ
بہترین نمطیہ فطرت" جسے شعراء "دفتر حسن" کہتے ہیں اور آج کل کی
اصطلاح میں آپ "مخزن جذبات" بھی بیوی کہیے۔ ؎

اس ٹکڑے سے پتہ چلتا ہے کہ مہدی افادی اپنے تخیل کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور
ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں جو پڑھنے والے کو انجانی دنیا سے متعارف کراتی
ہے۔ مہدی افادی کی یہ مخصوص پہچان ان کو اپنے زمانے کے انشائیہ نگاروں سے الگ
بھی کرتی ہے۔

سجاد انصاری

سجاد انصاری ان انشائیہ نگاروں میں سے ہیں جن کے فن کا اعتراف بیشتر
نقادوں نے کیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ان کی انشائیہ نگاری کو سراہتے ہوئے
لکھا ہے کہ:-

> سجاد کے یہاں فلسفہ اور ادب لطیف کا حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے
> اس بنا پر وہ ادب لطیف کے فلسفی کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کی رومانی
> خیال "آتش سیال" اور "ارتعاش رنگین" والی نہیں۔ حقائق کو الٹنے
> پلٹنے اور ان کی رنگینی سے لطف اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے وہ ایک

؎ افادات مہدی۔ مہدی افادی صفحہ ۱۵۲

اسٹائل کی وجہ سے اہم ہیں" ؎۱

سجاد انصاری کی شخصیت اور ان کا فن ایک دوسرے میں رچے بسے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ کے لئے جو اوصاف ضروری قرار دیئے جاتے ہیں ان کا بھرپور اظہار سجاد انصاری کے انشائیوں میں ہوا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اس کو اپنے انشائیوں میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی جب انشائیہ میں جگہ دیتے ہیں تو وہ بہت اہم نظر آنے لگتی ہے۔ ان کی چھوٹی سی چھوٹی بات میں بھی کوئی اہم نکتہ پوشیدہ ہوتا ہے

سجاد انصاری کے انشائیوں کو پڑھتے ہوئے بہت صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا انداز بیان دلکش ہے۔ ان کے ہاں جدت اور خیالات میں گہرائی ہے اور ان کا انداز فکر اور وسعت کا حامل ہے۔ ان کے انشائیوں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مختصر سے مختصر جملوں میں بڑی بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنے مدعا کو مکمل طور پر واضح کرتے اور قاری کے ذہن میں وہ بات پوری طرح منتقل ہو جاتی ہے۔ اس لئے بعض لوگوں نے ان کی ایک خصوصیت اختصار پسندی بتائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اختصار کی وجہ سے بات میں تو کیف پیدا ہوتا ہے جو کسی بھی ادیب کے لئے فخر کی بات ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی اختصار پسندی سے انشائیہ کا حسن بھی مجروح ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ نگاری میں بیان، انداز بیان اور انشاپردازی ہیئتوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ جبکہ انشائیہ نگار اگر اختصار بھی کرے تو اس کے ساتھ ساتھ انشاپردازی کے جادو بھی جگانے۔

سجاد انصاری کے انشائیوں میں ملون کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا انشائیہ ملون نہ صرف ان کی تحریروں میں بلکہ انشائیہ نگاری کی پوری تاریخ میں یاد رکھے جانے کے قابل ہے اس انشائیہ میں سجاد انصاری نے اپنے تخیل اور انوکھے استدلال کے بہت سے نمونے چھوڑے ہیں لیکن انشائیے میں بحر رسمی طریق کار اختیار کر کے اسلوب کو تازہ کار بنایا گیا ہے اس بات کا اندازہ "ملون" کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگا سکتے ہیں۔

؎۱ بحوالہ انشائیہ ڈاکٹر آدم شیخ صفحہ ۶۳

"تلون ذہانت اور وسعت خیال کا لازمی نتیجہ ہے یکسوئی اور استقلال خواہ خیالات میں ہو یا اعمال میں ذہنی اور دماغی اضمحلال کا ثبوت ہے۔ محض تنگ نظری اور بزدلی استقلال

اور یک رنگی کی ذمہ دار ہیں۔ ذہانت تنوع پسند اور تغیر پسند ہو سکتی ہے۔ وہ وسعت نظر اور وسعت عمل دونوں چاہتی ہے۔ اس لئے اس سے استقلال کی امید رکھنا اس کی حماقت کرنا ہے۔ تنگ نظری انسان کو مجبور کرتی ہے کہ ایک محدود فضا میں وہ ہمیشہ کے لئے مقید ہو جائے ایک تنگ نظر اور تنگ حوصلہ انسان مستقل مزاج بھی رہ سکتا ہے اور مستقل عمل بھی، اس کی بزدلی تغیرات کو برداشت نہیں کر سکتی لیکن ذہانت کے سامنے ہزاروں راستے ہوتے ہیں۔ وہ قطعی طور پر غیر ذمہ دار ہے وہ نہ کسی قانون کی قائل ہے اور نہ کسی بندشوں کی۔ وہ جانتی ہے کہ دنیا کا ہر قانون ناجائز ہے اور ہر بندش بے جا" [1]

مخزن خیال سجاد انصاری کے انشائیوں کا مجموعہ ہے اس مجموعے میں تلون کے علاوہ حقیقت عریاں، محاسن و معاصی اور عورت بہت اہم ہیں۔
اس سلسلے میں نمونے کے طور پر محاسن و معاصی کا ایک اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے

"غالب نے اخلاقی بندشوں کی مہملیت کا صحیح اندازہ کر لیا وہ اس راز سے بے خبر نہ تھے کہ بعض ایسے لطیف مواقع انسانی زندگی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن میں عام ممنوعات فرائض بن جاتے ہیں اور ہر گناہ ثواب، اگر تمام بندشیں حسن عمل سے توڑ دی جائیں

---

[1] مخزن خیال۔ سجاد انصاری "تلون"

معصیت خود ہی معصیت بن جاتی ہے۔ اگر کسی انسان میں معصیت رنگین کی
صلاحیت ہے لیکن وہ محاسن خشک کی طرف کھینچ رہا ہے، اس کی
بدنصیبوں کی کوئی انتہا نہیں"[1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ گناہ و ثواب کے نازک معاملے کو سجاد انصاری نے
خوبصورت اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔

مندرجہ ذیل اقتباس ان کے انشائیے "عورت" کا ہے جس میں انہوں نے
عورت کی نفسیات اور اس کی خود داری کو ایک ماہر نفسیات کی طرح پیش کرنے کی
کوشش کی ہے۔ جس میں وہ ایک حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

"عورت چاہتی ہے کہ اس کی نسوانیت ساری کائنات کو مسخر کر دے
لیکن خود اس کی نسوانیت محض ایک محبت کرنے والے کی محکوم بننا
چاہتی ہے۔ اگر کوئی اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تو جذبۂ نسوانیت
مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن عین اس عالم میں عورت کی غیر مطمئن
فطرت بغاوت کرتی ہے وہ صرف اس صورت میں مطمئن
ہو سکتی ہے جب اس کی آنکھوں کے سامنے ساری دنیا اس کی
حکمرانی کو تسلیم کرلے"[2]

سجاد انصاری کے مندرجہ بالا انشائیوں کے نمونوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ ان میں کوئی
شک نہیں ہوتی کہ ان کے یہاں احساس کی شدت اور جذبہ کا عنصر پایا جاتا ہے
وہ اکثر قول محال (PARADOX) کا استعمال کر کے ایک ہی بات میں متضاد
گوشے پیدا کر لیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے سجاد انصاری کے اسلوب میں الحاد کی
شکایت کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سجاد انصاری جیسا ضرب المثل ہو جانے
والے فقرے لکھنے والے آدمی پر کبھی الحاد کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ جو آدمی اس طرح کے

---

[1] محشر خیال۔ سجاد انصاری (محاسن و معاصی) صفحہ ۱۲۳۔۱۲۲

[2] محشر خیال سجاد انصاری ("عورت") صفحہ ۱۲۶

جملے لکھ سکتا ہو کہ :-

"ایک حسین گناہ کا ارتکاب ہزاروں خشک نیکیوں سے بہتر ہوتا ہے"

اس ادیب پر بھلا الحاد کا الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے۔

خلیق دہلوی

ادب لطیف کے انشاپردازوں میں ایک اہم نام خلیق دہلوی کا بھی ہے ان کے انشائیے یوں تو خالص انشائیہ نگاری میں معلوم ہوتے لیکن جب ہم فن انشائیہ کے ارتقائی مرحلوں کا ذکر کریں تو ان کی تحریروں کا حوالہ لازمی طور پر آئے گا۔ ان کے انشائیوں میں ممتاز ترین انشائیے "حریص رقص" "باسی ہار" اور "دراسو" ہیں۔

خلیق کی نثر کا اسلوب نہایت خوبصورت اور دلکش ہے۔ اس میں سادگی، بے تکلفی اور شگفتگی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگر ان کے کسی بھی انشائیے کے نمونے کو سامنے رکھا جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ سادگی اور شگفتگی ہر سطر میں نمایاں ہے "باسی ہار" میں جس طرح کی شگفتگی ملتی ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے

"تیری رعنائیوں کو کس طرح بھلا دوں؟ تیری رنگینیوں کو کس طرح فراموش کر دوں؟ محبت کی فضائے خاموش تیرے نغمہ ہائے یاسمیں سے معمور ہے؟ رات کا پچھلا حصہ ہے پاک چاندنی پڑے

شاداب پھولوں کی بہار کی نکہت مہربانی ہے کیا بھلا دینے کی چیز ہے" [۱]

خلیق دہلوی نے دہلی کی شستہ اور شیریں زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے
ان کو اپنے اظہار پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کی تحریروں میں مصنوعی انداز یا تکلف
نہیں ملتا۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ خلیق کی انفرادیت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ بول
چال کی زبان کو تحریری زبان سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ خلیق دہلوی کی انشاپردازی
کو اختر شیرانی نے ادستان کے دیباچے میں اس طرح خراج تحسین پیش
کیا ہے

"ان کی تحریر و تقریر میں مطلق فرق نہیں وہ جس طرح بولتے ہیں اسی
طرح لکھتے ہیں ان کو اردو زبان و ادب اور اس کے اظہار پر حیرت
انگیز عبور حاصل ہے۔ حضرت خلیق کی یہ اولین خصوصیت ہے جس کی
مثال بایں جامعیت کہیں نظر سے نہیں گزری" [۲]

خلیق دہلوی کے انشائیوں کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ قاری اس کو پڑھتے ہوئے
اسلوب بیان اور شگفتہ نثر میں اتنا کھو جاتا ہے کہ موضوع بھی اس کی نگاہوں سے
اوجھل ہو جاتا ہے اسی بات کو ان الفاظ میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خلیق کی نثر کو پڑھنے والا
انشاپردازی سے اتنا مسحور ہو جاتا ہے کہ پھر وہ موضوع سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے
یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے باعث خلیق کو ادب لطیف کے نثر نگاروں میں امتیاز حاصل ہے
اختر شیرانی نے اپنے مضمون میں آگے چل کر خلیق کے نثری اسلوب کا تجزیہ ان
الفاظ میں کیا ہے :۔

"تحریر و نگارش کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں جن سے اظہار خیال کے
دوران دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ایک خارجی یعنی الفاظ یا فقرات، دوسرے داخلی
معنی یا خیالات۔ ایک پختہ کار ادیب کا فرض یہ ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں کو

---

[۱] ادستان خلیق دہلوی (بہاری یار) صفحہ ۷۷
[۲] ادستان خلیق دہلوی مقدمہ اختر شیرانی صفحہ ۱۳

بلحاظ ہم آہنگی اس طرح "دست و گریبان" کر دے کہ ان کی افراد یتیں کھو جائیں اور ان کے ملے جلے مجموعی اثرات بیک وقت ناظرین کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ یہ نہ ہو کہ خیالات بہت ارفع یا نزاکت کی حامل ہوں مگر الفاظ درشتی و کرختگی کے آئینہ دار۔ یا یہ کہ خیالات و مطالب ہیبت و وحشت کے کسی جذبے کے حامل ہوں۔ مگر الفاظ و فقرات، حلاوت و شیرینی کے رنگ سے لبریز" [1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیقی کے بارے میں جن خوبیوں کی طرف اختر شیرانی نے اشارہ کیا ہے ان کا التزام کم و بیش ہر جگہ ملتا ہے۔ خلیقی کے یہاں لفظ و معنی یا ظاہر حسن اور داخلیت اس طرح ہم آہنگ ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والے کے لئے موضوع اور بیان کو الگ الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اصلی ادب کے بارے میں ہر زمانے میں اس خصوصیت کو اہمیت دی جاتی رہی ہے کہ جب تک لفظ و معنی یا صورت و معنی اس طرح ہم آہنگ نہ ہو جائیں کہ ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن معلوم ہو۔ اس وقت تک کوئی ادبی تخلیق بڑی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ خصوصیت خلیقی کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے خلیقی کا فن اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے ۔۔

---

[1] ادبستان خلیقی دہلوی (مقدمہ اختر شیرانی)

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی کی ساری شہرت ان کی انشاء پردازی کی وجہ سے ہے ان کی نثر کی خصوصیت تو سب سے پہلے ان کے عنوانوں سے ہی جھلکنے لگتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے مضامین کے عنوانات نہایت دلکش اور اچھوتے ہوتے ہیں ان کا کوئی بھی مضمون پڑھنا شروع کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ شگفتگی کے ساتھ ساتھ سبق آموزی کے عنصر کو انہوں نے کبھی اپنی نگاہ سے اوجھل ہونے نہیں دیا۔ یہ بات درست ہے کہ ان کے کچھ انشائیوں میں وعظ کا رنگ بھی ملتا ہے لیکن جن نقادوں نے خواجہ صاحب کی اس کمی کا احساس دلایا ہے کہ ان کا لہجہ ایک انشائیہ نگار کا لہجہ نہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ جب کہ ان کے برخلاف انتظار حسین نے ان کے مضامین کے بارے میں ایک ایسی رائے کا اظہار کیا ہے جس سے ان کے انشائیہ نگار تسلیم کئے جانے کا اندازہ ہوتا ہے:-

> "خواجہ حسن نظامی نے جھینگر کا جنازہ لکھا تو اس سے سمجھ میں آیا کہ لکھنے کا اسلوب یہ بھی ہے کہ آپ لمبے اسٹے نہیں۔ انشائیہ لطیفہ نہیں، انشائیہ نہیں یہ آپ کی مرضی ہے" [1]

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا مجموعہ "سی پارۂ دل" ہے اس مجموعے کے اہم عنوانات اس طرح ہیں۔ "آنسو کی سرگزشت" "مچھر" "جھینگر کا جنازہ" اور "الف خالی" ہیں۔ ان مضامین کو اچھے انشائیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ اکثر غیر اہم باتوں کو بھی اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ قاری چونکے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے انشائیوں میں ندرت اور تازگی لیے نقطہ کمال پر نظر آتی ہے۔ ان کے انشائیے "الف خالی" کے اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بات سے بات کیونکر پیدا کرتے ہیں اور اپنے بیان پر کتنی قدرت رکھتے ہیں:-

---

[1] بحوالہ انشائیہ کی بنیاد۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ صفحہ ۱۲۷

الف کی یہ بے معنی بجز مفہوم مگر مزے دار باتیں سن کر میں نے بڑا تعجب کیا کہ تصوف سے تعلق رکھنے والی بے نتیجہ باتیں بھی اتنا کیف رکھتی ہیں تو بانتیجہ حالات میں کیا سرور ہوگا۔ طالبوں سے کہو اندر آ کر دیکھیں اور اس تک پہنچیں جس کے سایہ اور عکس کی یہ ادنیٰ سی کیفیت ہے" ۔ ۱؎

خواجہ حسن نظامی کا ایک اور اہم انشائیہ مچھر ہے۔ وہ مچھر جو ادنیٰ سا کیڑا ہے اور بظاہر اہم معلوم ہوتا ہے اس کی ذات کے بیان میں خواجہ حسن نظامی نے بہت سی باریکیاں پیدا کر دی ہیں۔ مچھر کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں ظرافت کی چاشنی موجود ہے :-

"انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔ کوڑے کرکٹ میل کچیل میں پیدا ہوتا ہے اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدل تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا ہے چرکے لگانا مردانگی نہیں۔ انسان درجے کی شکل سے صورت کا دیکھو کالا ممنا۔ لمبے لمبے پاؤں بے ڈول چہرہ اس شان و شوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چٹے، خوش وضع پیاری اداکی دشمنی بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں" ۔ ۲؎

ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ کے ارتقا میں خواجہ حسن نظامی کا کیا رول رہا ہے اور ان کے انشائیے کس اہمیت کے حامل ہیں ۔

۱؎ سی پارۂ دل، خواجہ حسن نظامی (حصہ اول) الف خانی صفحہ ۲۸۹-۲۸۸

۲؎ ، ، مچھر صفحہ ۱۳۷

فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ کو ان کے خاکوں اور انشائیوں کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں کو انشائیہ کا نام تو نہیں دیا لیکن ان کے بعض مضامین میں انشائیے کی خصوصیات اس حد تک پائی جاتی ہیں کہ انہیں انشائیہ کے علاوہ کوئی اور نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم فنِ انشائیہ کے نقطہ نظر سے ان کی ایسی تحریروں کو دیکھیں تو "مردہ بدست زندہ"، "پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر"، "نئی دلی" اور "دام خیال" وغیرہ کو انشائیوں کا ہی نام دیں گے۔ انشائیہ کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں پر لطف انداز اختیار کر کے زندگی کی حقیقت کو پیش کر دیا جائے اگر ہم "مردہ بدست زندہ" کے اس اقتباس کو دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس میں انشائیے کی بنیادی صفت پائی جاتی ہے۔

"اب راستے والوں کی سنیئے اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا اور کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ آ کے مرنے والے کا نام پوچھا، مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات انہی کو تفویض کر دیا ہے۔" [1]

ان کا ایک انشائیہ نما مضمون "نئی دلی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس مضمون میں فرحت اللہ بیگ نے نئی دلی کی نئی تہذیب کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ انشائیہ جدید تہذیب پر ایک طنز بھی ہے اور دلچسپی کے عنصر کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس سلسلے میں "نئی دلی" کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:۔

"اب لباس کیا ہے بس یہ سمجھ لو کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا

---

[1] مضامین فرحت حصہ دوم فرحت اللہ بیگ "مردہ بدست زندہ" صفحہ ۲۶

سلیقہ کا یہ حال ہے کہ بچوں کی مالک آیا، باورچی خانہ کی مالک ماما ہے سینے پرونے کی ذمہ داری درزی نہیں تھی ماسٹر پر اب ان کو گھر والیاں کون کہے گا۔ شام ہوئی اور بیگم صاحبہ ہوا خوری کو نکلیں۔ جب آپ ایک طرف گئے اور میم صاحبہ دوسری طرف۔ اب نہ ان کو ان کی خبر اور نہ ان کو ان کی خبر لے

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں میں دلی کی ٹکسالی زبان کے علاوہ شگفتگی اور لطف کے عناصر بھی پورے طور پر پائے جاتے ہیں۔ وہ روز مرہ اور محاورہ کا بہت ہی برمحل استعمال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے معمولی موضوعات میں بھی زندگی پیدا کر دی ہے ان کا ایک مضمون " اونگھ " ہے۔ بظاہر اب لگتا ہے کہ اونگھ کا لفظ ادا کرنا ایک طرح کی بے اطمینانی ظاہر کرنا ہے۔ اونگھ کے لفظ سے بھی بے دلی ظاہر ہوتی ہے، بھی بے دلی اور کبھی انکار کا تاثر ملتا ہے۔ انہوں نے اونگھ کے لفظ کا استعمال مختلف طبقوں اور لوگوں کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بیوی کی اونگھ بہت سے زیادہ تشویشناک ہوتی ہے ان کے مضمون "اونگھ" کا اقتباس ہے۔

" گھر والی کی اونگھ بہت سے زیادہ خطرناک اونگھ ہوتی ہے کسی ماما پر خفا ہو رہی ہیں وہ برابر جواب دیئے جاتی ہے یہ اونگھ کے خاموش ہو جاتی ہیں لیجئے لوگ منہ بولے گئے گھر کا سارا انتظام درہم برہم ان کے اختیارات سلب گھر کی حکومت ان سے چھن کر ماماؤں کے ہاتھ میں چلی گئی " ؎

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

" ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ آپ اس کے مطالعے کے بعد کتاب کو چند لمحوں کے لئے بند کر دیں اور انشائیہ میں بکھرے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لیکر خود بھی سوچیے اور محظوظ ہوتے چلے جائیں ؎۳"

لے مضامین فرحت حصہ دوم فرحت اللہ بیگ نئی دلی صفحہ ۵۰
؎ " " اونگھ صفحہ ۸۵
؎۳ تنقید اور احتساب ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۲۰۵

اگر ہم وزیر آغا کے اس خیال کی روشنی میں فرحت اللہ بیگ کے انشائیوں کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ خوبیاں ان کی تحریروں میں پورے طور پر پائی جاتی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کے انشائیوں کا انداز شگفتگی کے ساتھ ساتھ بے ساختگی بھی لئے ہوا ہے ان میں مزاح کی چاشنی بھی ہے اور طنز کی لطافت بھی۔ فرحت اللہ بیگ کی ان خوبیوں کا اعتراف زیادہ تر نقادوں نے کیا ہے۔ وزیر آغا بھی ان کے معترف نظر آتے ہیں وہ اپنی کتاب "تنقید اور احتساب" میں ایک جگہ فرحت اللہ بیگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "فرحت اللہ بیگ کے یہاں وہ بہت سی باتیں ملتی ہیں جو انشائیہ کا امتیازی وصف قرار پا چکی ہیں۔ مثلاً شگفتہ انداز نگارش اور موضوع سے مصنف کا گہرا تعلق" ؎۱

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشائیہ کی تاریخ میں فرحت اللہ بیگ کی تحریروں کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور فرحت اللہ بیگ کے متعدد مضامین انشائیے کے ذیل میں آتے ہیں ۔۔۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد جہاں ایک طرف مستند عالم اور صحافی تھے وہیں وہ ایک اعلیٰ درجہ کے انشاء پرداز بھی تھے۔ انہوں نے اپنے علم و فن کا اظہار بہترین نثر میں کیا ہے اور اپنی صحافت میں بھی صاحب اسلوب نثر نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ عام طور پر انشائیہ نگاری میں جو انداز اختیار کیا جاتا ہے اس کا تعلق ہلکے پھلکے موڈ اور ذہنی لہر سے ہوتا ہے لیکن

؎۱ تنقید اور احتساب ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۲۱۰

مولانا آزاد کے یہاں ہر طرح کی نثر میں ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور وقار ہے وہ علمی وقار کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ غبار خاطر یوں تو ان کے خطوط کا مجموعہ ہے لیکن اپنے خطوط میں بھی ان کا انداز ایک انشا پرداز کا ہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں رومانیت، بغاوت، عامیت اور خودداری کی نشاندہی بہت سے لوگوں نے کی ہے قاضی عبدالغفار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"اردو ادب میں کوئی دوسرا ادیب الفاظ میں اتنا حسن اور اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے ناز اٹھانے عوام کی ذہنیت پر حاوی نہیں[1]

ویسے تو انشا پردازی کی چند مثالیں ان کے خطوط سے بھی دی جا سکتی ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ اس سلسلے میں ان کے ایسے مضامین کا سہارا لیا جائے جو صحیح معنوں میں انشائیہ کے قریب ہیں۔ مثلاً تذکرے ہیں جو مختلف ابواب یا عنوانات میں ان کے تحت مولانا نے اپنی سوانح کم بیان کی ہے اور انشا پردازی زیادہ بیان کی ہے۔ مثلاً تذکرے کے ایک مضمون کا عنوان "حالِ دلِ زار" ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"گو اس کی گرفتاری میں بھی گرفتاری اور اس کا الجھاؤ بھی الجھاؤ ہے لیکن بہرحال یہی کیا کم بڑا فتح ہے کہ اس کی بدولت کام بہت آسان اور مختصر ہو جاتا ہے اور آنے والی منزل کے سارے کاموں کی مشق پہلے سے ہو جاتی ہے۔ پہلے سو زنجیروں کو توڑنا پڑتا تو اس کی بدولت صرف ایک ہی زنجیر سے چھوٹنے کا معاملہ باقی رہ گیا۔ پہلے ہزاروں چوکھٹوں کی جبہ سائیوں سے پیشانی دو چار تھی۔ کس کس دراغ کو مٹاتے؟ کن کن پرستش گاہوں کو ڈھاتے؟ اب خود بخود سب مٹ گئے صرف ایک ہی چوکھٹ کا نشان سجدہ رہ گیا اور اصل کام بھی یہی تھا کہ پیشانی ایک ہے تو سجدہ گاہ بھی ایک ہی ہو۔ جب یہاں تک معاملہ پہنچ گیا اور

---

[1] انشائیہ ڈاکٹر آدم شیخ صفحہ ۷۲

ایک کے لیے سب کو چھوڑنے کا سبق مل گیا، تو اس ایک کو بھی مسجود
حقیقی کی خاطر چھوڑنا کیا مشکل ہے؟ ممکن ہے کہ ایک ہی جھٹکے میں یہ
رشتہ آخری بھی ٹوٹ جائے" ؎۱

اس اقتباس میں مولانا نے اپنے بچپن کے حالات یا اپنی فکری کیفیات بیان کی ہیں
لیکن ان ہی جملوں میں شک اور عقیدے تک کی کیفیات کو سمیٹ لیا ہے اور اسلوب
اتنا خوبصورت اور دلکش اختیار کیا ہے کہ ذہنی اور فکری بلندی کے اتار چڑھاؤ پڑھنے والے کو یہ
باتیں کچھ اجنبی نہیں معلوم ہوتیں اس کا پڑھنے والا اس کے اسلوب کے جادو سے
مسحور ہوتا چلا جاتا ہے۔

مولانا نے تذکرے میں ہی ایک اور جگہ اپنے قلم کا جادو اس طرح جگایا ہے:۔

"آنکھیں کھولیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی اور خواہشوں اور ولولوں
کی شبنم سے خارستان ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا
اپنی طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم
ہوا کہ اس صبح فریب کے لیے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے اور نہ ناامیدی
اور ناکامی کی شام۔ یہ سارا شبستان امید اور نگارخانہ نظر فریب
صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کامجوئیوں کے لیے بنا ہوا ہے اور گوشہ
گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لیے چشم براہ ہے جس
طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی معلوم نہیں اپنی ہی گنبد غفلت
اور ہنگامہ ہوس کی گونج تھی یا لوگ عشاقان طلسم شباب کی بجلیوں
کے لیے خود ساز ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے۔" ؎۲

اس اقتباس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی خود نوشت نہیں لکھی ہے بلکہ اپنے کو

؎۱ تذکرہ ابوالکلام آزاد (مالک رام) صفحہ ۳۲۰-۳۲۱

؎۲ " " " صفحہ ۳۱۵

ایک دوسرا آدمی تصور کر کے اس کے سہارے انشا پردازی کے جلوے دکھائے ہیں۔

مولانا آزاد کی اس طرح کی تحریروں کو محض انشائیہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان میں انشائیہ کی وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کو صنف انشائیہ کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے اس طرح انشائیہ نگاری کی تاریخ میں مولانا آزاد کی تحریروں کو جگہ نہ دینا ایک عظیم فن کار اور انشا پرداز کے ذکر کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا۔

نیاز فتحپوری

نیاز فتحپوری کے اسلوب تحریر کو عام طور پر تخلیقی اسلوب کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیاز کا انداز نگارش دوسروں سے انتہائی مختلف اور انفرادیت کی شان لئے ہوئے ہے کہ ان کی نثر کے ایک بڑے حصے کو اگر انشائیہ نگاری قرار دیا جائے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ انہوں نے اپنے مضامین عام طور پر آزادانہ انداز میں لکھے ہیں لیکن ان کے جن مضامین میں انشائیہ کی شان پائی جاتی ہے ان کے انشائیوں کے طور پر "برسات" "عورت" "ایک تصور فرشتہ" "ایک رقاصہ سے" جیسے مضامین کا نام لیا جا سکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ "ایک تصور فرشتہ" میں انشائیہ کے ساتھ تمثیل کا بھی رنگ نمایاں ہے۔

ان کے انشائیے "برسات" میں برسات کے منظر کی اس قدر خوبصورت عکاسی کی گئی ہے کہ برسات کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

اسی طرح "عورت" اور "ایک رقاصہ سے" میں ان کا سارا محور اور مرکز عورت معلوم ہوتی ہے ایک مضمون (عورت) کو بیوی بہن اور ماں جیسے تقدس کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تو دوسرے مضمون (ایک رقاصہ سے) میں اسے ایک شمع محفل کی حیثیت دی گئی ہے جس کا کام سب لوگوں کا دل بہلانا ہے۔ اس انشائیہ میں نیاز نے جذبات نگاری کا بھرپور استعمال کیا ہے اس سلسلے میں "ایک رقاصہ سے" کا یہ اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے

"جس وقت تو تیز ہو اٹھ کر اپنے پاؤں سے زمین کو ٹھکراتی ہے اور وہی جنبش رفتہ رفتہ تیری کمر تک آکر پہلے ایک خفیف سی لرزش اور پھر ہلکے ہلکے ہچکولوں میں تبدیل ہو جاتی ہے تو تیرے ہاتھ پاؤں میں بھی ایک اضطرابی جنبش پیدا ہونے لگتی ہے اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ اگر یہ سلسلہ [illegible] تیری کمر سے جدا ہو گئی تو تیری نبض ہی چلتے چلتے ٹھہر جائے گی حالانکہ اس سے قبل میں نے بارہا تیری کمر کو چلتے دیکھا ہے، جھکتے اور [illegible] کو جھٹکا دیتے بل کھاتے دیکھا ہے مگر ایسی حالت کبھی نہیں ہوئی" [1]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز نے رقص و سرود کی محفلوں کو انتہائی باریکی سے دیکھا ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر ان کی نظر کتنی گہری ہے انہوں نے ایک رقاصہ کی نفسیات کو بھی بڑی ہی چابکدستی سے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ کم و بیش یہی کیفیت ان کے انشائیہ "ایک مصور فرشتہ" میں بھی ملتی ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اس انشائیہ میں جذبات نگاری کے بجائے تخیل کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فرشتہ جیسی روحانی مخلوق کو جسمانی روپ دے دیا گیا ہو۔ اس ضمن میں زیر بحث انشائیہ "ایک مصور فرشتہ" کا یہ ٹکڑا

---

[1] نگارستان نیاز فتحپوری (ایک رقاصہ سے) صفحہ ۸۳

ملاحظہ کیا جا سکتا ہے :-

"ساحل پر ایک فرشتہ خاموش کھڑا تھا اس منظر کو محو منظر سمجھنے کی کوشش میں مستغرق وہ چاند کو دیکھتا ہے اور دیر تک محو رہنے دیکھنے کے بعد اس طرح اپنی نظر کو آہستہ آہستہ اس وادی تک لاتا ہے گویا چاند کی شعاعوں کے ساتھ اس نگاہیں بھی پھولوں تک آکر پھیل گئیں۔ اس نے پردوں کی شکنیں دور کیں بازو پھیلائے اور زمین پر قدم ایک ہاتھ میں لب ساحل پر پانی لے تھا کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ مشغول تھا کچھ سوچ رہا تھا اور اس ورق زر پر کچھ لکھا جا رہا تھا کہ دفعتاً وہ چونک پڑا اور اس نے ورق علیحدہ رکھ کر وادی کی طرف منہ کر کے ہاتھ بڑھا دیا۔ خوشبو کی موجیں جو اٹھ رہی تھیں انہوں نے سمٹنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ سمٹتے سمٹتے ملجا ہو گئیں اور انہوں نے ایک سفید نورانی شفاف جسم اختیار کر لیا" ؎۱

اس اقتباس میں نیاز کا مخصوص اسلوبیاتی رویہ سامنے آیا ہے جس میں تمثیلی رنگ بھی ہے اور منظر نگاری بھی۔

ان افسانوں کے علاوہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ فرسان اور عورت جیسے افسانوں میں نیاز کی منظر نگاری کا بنیادی جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔ مثلاً فرسان کے اس اقتباس کو دیکھا جا سکتا ہے :-

"افق کے وہ ساحر بادل جن کے حیات بخش کناروں سے ارغوانی کرنیں چھوکر آبشار رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہیں اس وقت جبکہ شفق کی ارغوانی شراب ساری وادی کو کناروں تک لبریز کرتی ہوئی بہ نکلتی ہے جہاں مجھ سے پوچھو کہ نیاز چوٹی پر ایک سنسان اور ویران جھونپڑے میں وہ باحول مجھے کیا نظر آتے ہیں۔ میں آنکھوں میں ارغوانی رنگ کی روشنی لے رہا

؎۱ نگارستان نیاز فتح پوری (ایک مصور عورت) صفحہ ۱۴-۱۵

کو لیے بیٹھا رہتا ہوں اور اب محسوس کرتا ہوں کہ میری آنکھوں سے اس وقت موسیقی نکل نکل کر تمام وادی کو گونجا رہی ہے پہاڑ اور اس کے درختوں کا سکوت وادی اور اس کی گہرائی کی خاموشی پہنائی اور اس کی موجوں کا سکون یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اس موسیقی میں ڈوب کر سو گئی ہے"۔ [1]

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب لطیف کے دوسرے نمائندوں کی طرح نیاز کی تحریریں بھی انشائیہ نگاری کے بنیادی عناصر کا احاطہ کرتی ہیں اور انشائیہ کی تاریخ میں نیاز کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے ۔

پطرس بخاری

اردو میں یوں تو پطرس بخاری کو طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے مگر طنز و مزاح سے الگ بھی ان کے مضامین کی ایک خاص حیثیت ہے جس کی بنیادی پہچان تازگی اور شگفتگی ہے اگر کوئی شخص محدود معنوں میں ان کے مضامین کو انشائیہ نہ بھی مانے جب بھی یہ ماننے کے بغیر چارہ نہیں کہ ان کی نثر میں انشائیہ کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں اسی بات کو بعض اور نقادوں نے اس طرح کہا ہے کہ ان کے مضامین انشائیوں سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین کی اس طرح کی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ ان کے ایک مضمون "کتے" کے اقتباس کو سامنے رکھا جائے ۔

---

[1] نگارستان نیاز فتحپوری (احساسات) صفحہ ۱۰۰-۱۰۱

"اگر خدا نے مجھے کچھ عرصے کے لئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائی تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو انسان کے لئے باعثِ ننگ ہے انگریزی کی ایک مثل ہے کہ بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے۔ یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے" [1]

اس اقتباس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کتے ہی کی طرح سے اپنے دوسرے مضامین میں بھی مزاح کے عنصر کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ انشائیہ کی خصوصیات کو بھی بخوبی برتنے کی کوشش کی ہے۔

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی کو ایک طنز نگار کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے اور مزاح نگار کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے ان حیثیتوں کے علاوہ ان کی ایک حیثیت خاکہ نگار کی بھی ہے مگر ان تمام پہلوؤں سے الگ انہوں نے کچھ ایسے مضامین لکھے جو صنفِ انشائیہ سے

---

[1] پطرس کے مضامین پطرس بخاری (کتے) صفحہ ۲۴

قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے جن مضامین میں انشائیہ کی خصوصیات پائی جاتی ہیں ان
میں "چارپائی" "ارہر کا کھیت" "پاسبان" "فرشتہ" اور "کچھ کا کچھ" کو بنیادی حیثیت حاصل
ہے۔ ان کے انشائیوں میں مزاح اور طنز کی چاشنی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی آزاد روی
اور منطقی تصورات کا اظہار ملتا ہے جو انشائیہ کی ایک بنیادی صفت ہے۔ رشید احمد
صدیقی کو "ارہر کا کھیت" اور "پاسبان" جیسے انشائیوں کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل
ہوئی۔ انہوں نے اپنے ان مضامین کو انشائیوں کا نام تو نہیں دیا تھا مگر ان میں زندہ
دلی اور مزاح کی شگفتگی کی وجہ سے بعد کے نقادوں نے ان مضامین کو انشائیے کی تاریخ کے
سنگ میل کا درجہ دیا۔ ان کے انشائیوں کے بعض نمونے[1] اگر غور سے دیکھے جائیں تو پتہ چلتا
ہے کہ ان کی زبان و بیان میں انشائیہ کی تمام خصوصیات موجود ہیں اور وہ جس سادگی کے ساتھ
ایسے تصورات کا اظہار کر دیتے ہیں وہ بہت کم انشائیہ نگاروں کے حصہ میں آتی ہے۔ اس
سلسلے میں "چارپائی" کے اس اقتباس کو بھی دیکھا جا سکتا ہے:۔

"چارپائی ہندوستان کی اسی طرح تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے
بڑا نمونہ ہے، ہندوستان اور ہندوستانیوں کی مانند ڈھیلی ڈھالی
شکستہ حال بے سروسامان لیکن ہندوستانیوں کی طرح مخاطب اور
حکمراں کے لئے ہر قسم کا سامان راحت فراہم کرنے کے لئے آمادہ"[1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ رشید صاحب نے "چارپائی" جیسی روز مرہ کے استعمال
کی چیز میں کس طرح کے نکات پیدا کر دیے ہیں۔ چارپائی بظاہر ادنیٰ سی چیز معلوم ہوتی
ہے مگر اس کو دیکھنے کے نئے زاویے ہمیں رشید صاحب کے یہاں ملتے ہیں یہی
خصوصیات "پاسبان" "فرشتہ" اور "ارہر کا کھیت" میں بھی ملتی ہیں۔ "ارہر کا کھیت" کا
ایک اقتباس اس طرح سے ہے۔

"ارہر کا کھیت" دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے کونسل اور اسمبلی کا تصور

---

[1] مضامین رشید۔ رشید احمد صدیقی (چارپائی) صفحہ ۸۷

یہیں سے لیا گیا ہے۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ یہاں معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے۔ ذرا وہ منشی جی کیوں آئے اور کیا کہہ کر گئے پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور منگوائے" [۱]

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گاؤں کی دیہاتی زندگی میں ارہر کے کھیت کے بعض معروف [illegible] ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اگر نکال دیا جائے تو اس بیان کو مسلسل [illegible] سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً رشید احمد صدیقی نے مرقع [illegible] کے لئے ارہر کے کھیت کا جو استعمال کیا ہے اور جیسا اس میں لطف پیدا کر دیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے اور ارہر کا کھیت جیسے انشائیوں کی بھی یہی خصوصیات ہیں [illegible] پڑھنے والے کو [illegible]

کنہیا لال کپور

کنہیا لال کپور کو ایک طنز نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے مزاح سے کہیں زیادہ طنز پر توجہ صرف کی ہے تاہم ان کے متعدد مضامین کو انشائیہ کا نام دیا جا سکتا ہے ان کے یہاں اگر طنز کا عنصر بہت شدت کے ساتھ نہ ملتا اور اس سلسلے میں اگر انہوں نے اعتدال سے کام لیا ہوتا تو ان کے انشائیوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی ان کے انشائیہ نما مضامین میں بھی جو طنز کی بالادستی ملتی ہے اسی کی وجہ سے ان کی خالص انشائیوں کی تعداد گھٹ کر رہ جاتی ہے لیکن ان کے مضامین "آگ جلانا" یا "چائے بنانا" اس سلسلے میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ "آگ جلانا" میں جس طرح انہوں نے "آگ جلانے" کے محاورہ کو طرح طرح

---

[۱] مضامین رشید – رشید احمد صدیقی (ارہر کا کھیت) صفحہ ۱۱۱

سے استعمال کیا ہے اس کا اندازہ ان کے انشائیے کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے :-

"دراصل آگ جلانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا آگ بجھانا۔ بلکہ آگ بجھانا آسان ہے اور آگ جلانا مشکل فرض کیجئے آپ کے گھر کو آگ لگ جائے یا آپ خود ہی گھر کو آگ لگا رہے ہیں۔ یوں ہی دل بہلانے کے لئے یا بیمہ کی رقم ہتھیانے کے لئے اس حالت میں آپ فائر بریگیڈ کو فون کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک آگ جلانے کا تعلق ہے آپ کسی سرکاری یا غیر سرکاری محکمے سے مدد طلب نہیں کر سکتے۔" ۱

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ کپور نے بعض شعروں کو بھی نثر میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے محاوروں سے بھی لطف کا پہلو پیدا کیا ہے۔ یہ خصوصیات بہر حال انشائیہ نگاری کی حیثیت سے کنہیا لال کپور کی اہمیت کو تسلیم کرانے کے لئے کافی ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی کا شمار اردو کے ان معدودے چند نثر نگاروں میں ہوتا ہے جو آج کے نثری ادب میں صف اول کے لکھنے والے شمار کئے جاتے ہیں۔ یوسفی نے مضامین بھی لکھے ہیں اور اپنے مزاحیہ مضامین کو فکشن کی حیثیت بھی دی ہے۔ ان کی کتابیں "چراغ تلے"، "خاکم بدہن"، "زرگزشت" اور "آبِ گم" کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کی بعد کی کتابیں تو دوسری نوعیت کی ہیں

۱ے شیشہ و تیشہ، کنہیا لال کپور (آگ جلانا)

البتہ "چراغ تلے" اور "خاکم بدہن" میں ان کے انشائیہ نما مضامین شامل ہیں ۔

ان کے مضامین کے سلسلے میں مجنوں گورکھپوری نے بڑی پتے کی باتیں کہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ادنیٰ سے ادنیٰ بات کے کسی نئے پہلو یا زاویے پر ہلکی سی روشنی ڈال کر اس کی طرف ہم کو متوجہ کر کے چونکا دینا اور پھر خود معصومانہ انداز میں آگے بڑھ جانا یوسفی کی وہ نزاکت ہے جو انہی کے حصہ میں آئی ہے یوسفی کا قلم جس چیز کو بھی چھوتا ہے اس میں نئی روئیدگی اور تازہ بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی کوئی سطر یا لفظی ترکیب ایسی نہیں ہوتی کہ پڑھنے والے کی فکر و نظر کو نئی روشنی نہ دی جاتی ہو" [۱]

ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسفی کے انشائیوں میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم ملتی ہیں جن چیزوں کو ڈاکٹر وزیر آغا یا سید محمد حسنین جیسے انشائیہ کے نقادوں نے ضروری قرار دیا ہے۔ یوسفی کے اہم انشائیوں میں "جنونِ لطیفہ" "چارپائی" "کلچر" "پڑیئے گر بیمار" اور "صنف لاغر" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے انشائیہ جنونِ لطیفہ کا یہ اقتباس بڑی اہمیت رکھتا ہے:-

"عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بد ذائقہ کھانا پکانے کا ہنر صرف تعلیم یافتہ بیگمات کو آتا ہے لیکن ہم اعداد و شمار سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پیشہ ور خانساماں اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔ اسی وجہ سے پچھلے سو برس سے یہ فن کوئی ترقی نہیں کر سکے"۔ [۲]

اسی طریقے سے ان کے دوسرے انشائیوں میں بھی بات سے بات پیدا کرنے اور ذہن کو آزاد

---

[۱] گرد پوش "زرگزشت" مشتاق احمد یوسفی

[۲] چراغ تلے۔ مشتاق یوسفی (جنونِ لطیفہ) صفحہ ۸۹

چھوڑ کر ملتز پیدا کرنے کی صفت ملتی ہے۔ ان کا ایک مشہور انشائیہ صنف لاغر کے عنوان سے ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس طرح سے ہے:-

"وزن حسن کا دشمن ہے اسی لئے ہر سمجھ دار عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی چربی کی دبیز تہوں کے خول کو سانپ کی کینچلی کی طرح اتار کر اپنی عزیز سہیلیوں کو پہنا دے۔ عقد ناگہانی کے بعد کہ جس سے کسی کو مفر نہیں ہر لڑکی کا بیشتر وقت اپنے وزن اور شوہر سے جنگ کرنے میں گزرتا ہے۔ جہاں تک زن و شوہر کی جنگ کا تعلق ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ شہید کون ہوتا ہے اور غازی کون لیکن زن اور وزن کی جنگ میں پلہ فریق اول ہی کا بھاری رہتا ہے۔" [1]

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شگفتگی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے معیار کا خیال یوسفی کی بنیادی خصوصیات میں سے ہیں۔ یوسفی کو موجودہ نثر نگاروں میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ ان کی زبان کو اب اردو نثر کا معیار قرار دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ابن انشا ان کی شگفتگی کو اعجاز فاروقی ان کی زبان کی برائی کو اور اسلم فرخی اس کی اہمیت اور برجستگی کو سراہتے ہوئے نظر آتے ہیں —

---

[1] چراغ تلے - مشتاق احمد یوسفی (صنف لاغر) صفحہ ۱۵۱

تیسرا باب

وزیر آغا اور انشائیہ کی صنف

علمی اور تنقیدی مباحث

وزیر آغا اور انشائیہ کی صنف (علمی اور تنقیدی مباحث)

گذشتہ دو ابواب میں انشائیے کے فن اور اس کے ارتقا کا تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے۔ زیر بحث باب میں انشائیے کے سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے خیالات اور نقطۂ نظر سے بحث کی جائے گی چونکہ ڈاکٹر وزیر آغا کو گذشتہ دو تین دہائیوں میں ایک اہم انشائیہ نگار کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور انہوں نے انشائیہ نگاری کے ساتھ ساتھ انشائیے کے فن پر بھی متعدد مضامین میں تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اس لیے ان کے نقطۂ نظر کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا جہاں ایک انشائیہ نگار ہیں وہیں ایک اہم نقاد بھی، انھوں نے عموماً نظم و نثر سے متعلق بہت سی اصناف پر مضامین اور کتابیں لکھی ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ انشائیہ سے ان کے فکری اور عملی تعلق کو اہمیت دی جاتی ہے۔

زیر نظر باب میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ انشائیہ کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے انشائیوں کے مجموعوں کے پیش لفظ میں اور اس موضوع پر دوسرے مضامین میں کس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نیز یہ کہ یہ دیکھنا بھی اہم ہے کہ وہ انشائیے کی تعریف اور اس کے حدود کیونکر متعین کرتے ہیں اور اس فن کے نقادوں کے خیالات سے ان کے خیالات کس حد تک مختلف ہیں ڈاکٹر وزیر آغا نے فراغت اور ہلکے پھلکے (Relaxed) انداز میں لکھی جانے والی نثر کو بنیادی طور پر انشائیہ کا نام دیا ہے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ انشائیوں میں دل آویزی، تازگی، رچاؤ اور شائستگی کے عناصر ضرور ہونے چاہییں۔ وزیر آغا جہاں ان شرطوں کے ساتھ انشائیے کی حد بندی کرتے ہیں وہیں ان شرطوں کو اپنے انشائیوں میں بھی برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انشائیوں کے ایک مجموعے "دوسرا کنارا" کے پیش لفظ میں انشائیہ نگار کے لیے تین خصوصیات ضروری قرار دی ہیں۔

(1) "پہلا نکتہ یہ کہ انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مراد یہ کہ

وہ عام سی کاروباری زبان کو استعمال نہیں کرتا بلکہ اپنی تخلیقی اُپج کی مدد سے عام الفاظ میں ایک ایسی برقی رو دوڑا دیتا ہے کہ وہ شعاعیں دینے لگتے ہیں گویا جس طرح شاعری میں ہر لفظ ایک نئی معنویت بن جاتا ہے بالکل اسی طرح انشائیہ نگار نثر کو تخلیقی سطح پر فائز کر دیتا ہے۔

(۲) دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انشائیہ نگار شئے یا مظہر کے مخفی مفہوم کو مس کرے......
انشائیہ نگار کی دور رس نگاہیں ایک ہی نظر میں شئے یا مظہر کے مخفی مفہوم تک پہنچ جاتی ہیں۔

(۳) آخری نکتہ یہ ہے کہ انشائیہ نگار ایک ایسے جہان میں معنی کا نظارہ کرے یا اس کا شعور اپنے مدار کو توڑ کر نیا مدار قائم کرنے میں کامیاب ہو۔ اسی بات کو آپ شعور کی توسیع یا (Extension of Consciousness) کا نام بھی دے سکتے ہیں" [۱]

ڈاکٹر وزیر آغا کے ان خیالات میں بعض نکتہ کی باتیں ضرور ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان نکات کو محسوس اور واضح انداز میں بیان نہیں کیا گیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے انشائیے میں لفظ کے تخلیقی استعمال پر زور دیا ہے اور دوسری بات یہ کہی ہے کہ جب بھی کسی چیز کو انشائیہ کا موضوع بنایا جائے تو انشائیہ نگار کا فرض ہے کہ وہ اپنے موضوع کی تمام گہرائیوں اور تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھے اور غیر ضروری بیان سے پرہیز کرے۔

انہوں نے تیسرا اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ جس موضوع پر انشائیہ لکھا جائے اس کے لیے ایسے امکانات کو بھی روشن کیا جائے جن کی وجہ سے لکھنے والے کے شعور کی توسیع کا اندازہ ہو اور پڑھنے والے کا شعور بھی بالیدہ ہو سکے۔ انہوں نے ایک جگہ یہ بات بھی کہی ہے کہ اچھا انشائیہ پڑھنے کے بعد پڑھنے والا خود اپنے آپ کو کسی قدر بدلا ہوا محسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کے فن کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے ہیں۔ یہ مضامین ان کے رسالے اوراق اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب اس قسم کے مضامین کا مجموعہ بھی انہوں نے

---

[۱] دوسرا کنارا۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۸

"انشائیہ کے خدوخال" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔
مذکورہ کتاب کے "حرف آغاز" میں انہوں نے تفصیل سے انشائیہ کے فن اور اس کی تنقید کے مسائل سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح گذشتہ برسوں میں انشائیہ پر ہونے والی بحثوں سے انشائیہ نگاری کے اصول اور ضوابط واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"بے شک ابتداء میں مغرب سے انشائیہ نگاری کے اصول درآمد ہوئے تھے اور ان پر سختی سے عمل درآمد بھی کیا گیا تھا۔ مگر پھر جیسے جیسے اردو انشائیے نے پر پرزے نکالے اور تازہ موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ انشائیے کی تنقید میں بھی نئے نئے ابعاد پیدا ہوتے چلے گئے" [1]

ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو انشائیہ اور مغربی انشائیہ کا بھی موازنہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ مغرب میں انشائیہ یقیناً ترقی یافتہ ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اردو انشائیہ نے ترقی نہ کی ہو۔
انہوں نے حرف آغاز میں ہی اس نکتہ پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ انشائیہ لکھنے کے دوران کس طرح اپنے آپ انشائیہ فہمی میں مدد ملی اور کس طرح انشائیہ کی تنقید میں مختلف پہلوؤں پر منکشف ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"ہر صنف بجائے خود ایک طرح کی کائنات اصغر ہے لہذا لازم ہے کہ لکھنے والا اس کائنات کے اندر سفر کرے اور اس سفر کے دوران اس صنف کا مسلسل عرفان حاصل کرتا جائے۔ انشائیہ کی صنف بھی ہمہ جہت، لاتعداد ابواب اور بے حد پر اسرار ہے جیسا بچہ اس کی تنقید بھی چند بندھے ٹکے خطوط میں جکڑی ہوئی نہیں رہ سکتی" [2]

ان باتوں سے جو تنقیدی مسئلہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح مختلف اصناف ادب کے اپنے اپنے امکانات ہوتے ہیں اسی طرح انشائیہ کے بھی اپنے امکانات ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ انشائیہ کی لچکدار صنف کو پورے طور پر استعمال کیا جائے اور اس کے بے شمار زاویوں کو غور سے دیکھا جائے۔

---

[1] انشائیہ کے خدوخال۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۷

[2] " " " ۸

ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک مثال دی ہے کہ آزاد نظم وغیرہ پر اردو داں طبقے نے جس طرح کے رد عمل کا اظہار کیا کم و بیش اسی طرح کا شدید رد عمل انشائیہ کے سلسلے میں بھی سامنے آیا۔ اس ضمن میں وزیر آغا کو دوسرے انشائیہ نگاروں کے درمیان یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے انشائیہ نگاری کو ایک تحریک کے طور پر برتا اور مسلسل انشائیہ کی وکالت کرتے رہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب "انشائیہ کے خدوخال" میں جو مضمون سب سے پہلے شائع کیا ہے اس کا عنوان ہے "انشائیہ کیا ہے؟" ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے انشائیہ کے مواد، تکنیک اور مقصد کی طرف بڑے کارآمد اشارے کئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انگریزی میں جس چیز کو پرسنل ایسے کہتے ہیں اس کی تعریف اس حد تک متعین نہیں ہے۔ جیسے بہت سی دوسری اصناف کی تعریف متعین ہے انشائیہ کے مفہوم اور ہیئت میں مواد کے لحاظ سے بھی اور تکنیک کے اعتبار سے بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں کہنے کو تو بیکن، لیمب اور چسٹرٹن کے مضامین کو انشائیہ کہا جاتا ہے۔ لیکن ان سب مضامین میں داخلی اور خارجی طور پر اتنا فرق ہے کہ سب کو ایک ہی زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ چونکہ انشائیہ لکھنے والوں نے ذہنی آزادی کا خاصا استعمال کیا ہے اس لیے مختلف انشائیے الگ الگ پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ وزیر آغا کا خیال ہے کہ انشائیہ کی سب سے بڑی صفت اس کا غیر رسمی طریق کار ہوتا ہے جو اس کو دوسری اصناف سے الگ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا منشور نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں ردو قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرے اور اپنے منفی ردعمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرے[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وزیر آغا کی نگاہ میں انشائیہ نگاری کے اصول بندھے ٹکے نہیں ہیں بلکہ ذہنی الجھنوں سے آزاد اور مصروفیات سے چھٹکارا پانے والا کوئی بھی ذہن جب تحریری خوش گپی کرتا ہے اور زندگی کے کسی بھی

---

[1] انشائیہ کے خدوخال۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۹،۱۰

پہلو پر اپنی آزادانہ رائے دیتا ہے تو اس تحریر کو انشائیہ یا انشائیہ جیسی تحریر قرار دیا جا سکتا ہے اس بات کی ایک بہت عمدہ مثال انہوں نے اس طرح سے دی ہے کہ عملی اور تنقیدی مضمون نگار اس افسر کی طرح ہوتا ہے جو دفتر کے قاعدے اور ضابطے کے تحت احتساب اور تجزیے سے کام لیتا ہے اور انشائیہ نگار ایک ایسا ادیب ہوتا ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد تنگ لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے میں کر خوش دلی کے ساتھ اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے وزیر آغا صاحب کہتے ہیں کہ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ انشائیہ لکھتے ہوئے ہم اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردعمل کو اجاگر کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ انشائیہ نگار تو بنیادی طور پر مسرت پہنچانا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ اکثر طنز وغیرہ سے گریز کرتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"بنیادی طور پر انشائیہ کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے اور اس کے عمل میں نشتریت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیہ میں طنز کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ محض ایک سہارے کا کام دیتا ہے اسی طرح انشائیہ کا خالق محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود نہیں رکھتا کیونکہ مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے" [1]

ان باتوں سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ وہ طنز نگاری اور مزاح نگاری سے انشائیہ کو مختلف ثابت کر کے دکھائیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو نثر کی تاریخ میں بیشتر طنز نگاروں اور مزاح نگاروں نے انشائیہ کی صنف کے لیے راہیں ہموار کی ہیں لیکن دونوں چیزوں میں فرق اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ انشائیہ میں طنزیہ اور مزاحیہ عناصر شامل ہوتے ہیں کوئی مضائقہ نہیں لیکن انشائیہ کو پورے طور پر طنزیہ اور مزاحیہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح طنز اور مزاح کے عناصر اگر انشائیہ میں شامل بھی ہوں تو انشائیہ مکمل ہونے کے بعد پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہو کہ وہ طنزیہ یا مزاحیہ مضمون نہیں پڑھ رہا تھا بلکہ اس نے کوئی ایسی چیز پڑھی ہے جس نے اس کی زندگی میں

---

[1] انشائیہ کے خدوخال ۔ ڈاکٹر وزیر آغا (انشائیہ کیا ہے؟) صفحہ ۱۰

کشادگی اور وسعت کا احساس پیدا کیا ہے ۔

انشائیہ کی ایک بڑی خصوصیت ڈاکٹر آغا کے نزدیک عدم تکمیل بھی ہے عدم تکمیل سے مراد یہ ہے کہ جہاں یہ بات ضروری ہے کہ موضوع یا عنوان کا خیال رکھا جائے وہیں یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ضروری نہ سمجھا جائے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً کے طور پر مقالہ لکھنے والا اس کوشش میں مبتلا رہتا ہے کہ مقالہ ہر اعتبار سے مکمل اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو جائے مقالے کے برخلاف انشائیہ نگاری میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہی جاتی ہیں جن کا موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا ۔ اسی بات کو وزیر آغا نے اپنے الفاظ میں یوں کہا ہے کہ انشائیہ کا ڈھانچہ ذرا لچکدار ہوتا ہے ۔ اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ :-

> "ایک مقالے کے بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا (Loose) ہوتا ہے اور اس میں مقالے کی منطقی کیفیت موجود نہیں ہوتی ۔ اس کے علاوہ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا اور انشائیے کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انشائیہ لکھنے والے نے موضوع کے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو اس کے شخصی رد عمل سے اثر پذیر تھے" [1]

اس گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے وزیر آغا نے انشائیہ اور غزل کے مشرب میں مماثلت بتائی ہے اور کہا ہے کہ جیسے غزل کا شاعر صرف اشارے کر کے گذر جاتا ہے اسی طرح انشائیہ نگار اپنے موضوع سے متعلق بعض کار آمد اشارے کر کے گذر جاتا ہے اور پڑھنے والے کے لیے سوچنے اور غور کرنے کی گنجائش پیدا کر دیتا ہے ۔ وزیر آغا نے مزید لکھا ہے کہ ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ بھی ہے کہ انشائیہ کے خاتمے کے ساتھ بات نہ ختم ہو جائے بلکہ لکھنے والے ہی کی طرح پڑھنے والا بھی دیر تک اس سے محظوظ ہوتا رہے ۔ انشائیہ کی ایک اہم صفت وزیر آغا نے

DS-2945

[1] انشائیہ کے خدوخال ۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۱

نزدیک اختصار بھی ہے جو عدم تکمیل کے نقطۂ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ وزیر آغا نے انشائیہ کو سانیٹ سے بھی تشبیہ دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بظاہر انشائیہ کا دائرہ محدود ہوتا ہے لیکن مختصر لفظوں میں انشائیہ نگار بہت کچھ کہہ جاتا ہے اور اس کی تحریر میں اندرونی مفاہیم بھی نکلتے ہیں یعنی وہ جو کچھ لفظوں میں کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ اشاروں، کنایوں میں کہہ جاتا ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ذہن زرخیز ہو اور اس کے پاس کہنے کو بہت سی باتیں ہوں تاہم وہ بہت سی باتوں کو جب تک اختصار کے ساتھ سمیٹ کر کہنے کا ہنر نہ سیکھ لے اس کے انشائیے میں وہ عظمت نہیں پیدا ہو سکتی ۔

ڈاکٹر آغا نے انشائیے کی اہم صفت تازگی بھی بتائی ہے جہاں تک تازگی کا سوال ہے تو ہر تخلیقی ادب میں تازگی کا عنصر پایا جاتا ہے لیکن انشائیے کے ساتھ تازگی پیدا کرنے کی صفت کو اس لئے اہمیت دی گئی ہے کہ شاعری اور انشائیے میں تازگی کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر غالب کا کوئی شعر تازہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانے کی تبدیلی کے باوجود شعر کے مفہوم میں تازگی کا پہلو محسوس کیا جا سکتا ہے دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تازگی کا مفہوم شعر کے نئے نئے معنی ہیں ۔ شعر کے برخلاف انشائیہ میں تازگی کا مفہوم موضوع کی تازگی سے بھی واضح کیا جا سکتا ہے اور نقطۂ نظر کی تازگی سے بھی جس کی وجہ سے پڑھنے والے کو ایک قسم کے نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ وزیر آغا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

"تازگی سے مراد موضوع اور نقطۂ نظر کا وہ انوکھا پن بھی ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سر نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے عام طور پر ہم مظاہر زندگی کے مظاہر کو ہر روز دیکھتے دیکھتے ان کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ بعض ان کے بہت سے نوکیلے کنارے نظر ہی نہیں آتے اور زندگی ہمارے لئے ایک کھلی ہوئی کتاب کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب محض ہمارے رد عمل کا قصور ہے، ورنہ زندگی کے دامن میں نئے پہلوؤں کے قحط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" [۱]

---

[۱] انشائیہ کے خدوخال ۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۳

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ زندگی کے وہ پہلو جو عام لوگوں کی نگاہ میں نہیں آتے انشائیہ لکھنے والا ان پہلوؤں کو دکھا کر تازگی کا احساس دلاتا ہے مثال کے طور پر کسی چیز کو مسلسل دیکھتے دیکھتے ہم اس کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعض ٹکڑوں کو اہمیت بھی نہیں دیتے جبکہ کوئی نیا آدمی جب اسی کو دیکھتا ہے تو اس میں نت نئے ٹکڑے اور پہلو نظر آتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی چیز کے مانوس ہو جانے کی وجہ سے بھی اس کا نیا پن ہماری نگاہوں سے چھپا رہ جاتا ہے۔ جب کہ وہی نیا پن کسی نئے آدمی کو بہت نمایاں نظر آتا ہے اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انشائیہ نگار اجنبی اور نامانوس نگاہوں سے زندگی کو دیکھے تو اپنی ہر تحریر میں تازگی اور تازہ کاری پیدا کر سکتا ہے۔

تازگی کے اظہار کے لیے انشائیہ نگار بہت سے طریقے اختیار کرتا ہے مثال کے طور پر کبھی اس منظر کو اس طرح پیش کرتا ہے جیسے اس کو بہت ہی بلندی سے دیکھا گیا ہو یا پھر کسی منظر کی تصویر کشی ایسے کرتا ہے گویا وہ طرح طرح کے آئینوں کے ذریعے اس کا عکس پیش کر رہا ہو۔ ان طریقوں کو استعمال کرنے سے انشائیہ نگار کا مقصد تصویر کے اس رخ کو پیش کرنا ہوتا ہے جو عام لوگوں کی نگاہوں سے عموماً پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انشائیہ میں قاری کو زندگی کے ایسے پہلو ملتے ہیں جو عام نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں تو قاری اس میں غیر معمولی تازگی محسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر آغا کا خیال ہے کہ انشائیہ نگار تازگی پیدا کرنے میں اگر مشورہ دینا شروع کر دے یا ناصح کا رول ادا کرنا شروع کر دے تو انشائیہ کی تازگی میں خلل پڑے گا ان کے خیال میں:-

> "انشائیہ نگار کا کام محض ایک عام چیز کے کسی نوکیلے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا ہے اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دینا ہے" [1]

اس ضمن میں وزیر آغا نے بہت سے انشائیوں کے عنوانات لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ عنوانات ہی زندگی کے نئے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ عنوانات:-

---

[1] انشائیہ کے خدوخال۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۳

1. In Praise of Mistakes (Robert Lynd),
2. On the pleasure of no Longer being young (G.K. Chesterton)
3. Why Distant Objects please (Hazlitt),
4. On the ignorance of the learned (Hazlitt)

ان عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزی زبان جس میں انشائیہ کو سب سے زیادہ فروغ ملا اس میں عنوانات سے چونکانے اور زندگی کے نئے پہلوؤں کو دکھانے کا کیا انداز نمایاں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب انشائیہ کے خدوخال کے متعدد مضامین میں انشائیے کی شناخت کے مسئلے کو اٹھانے کی کوشش کی ہے اور مذکورہ بالا نکات مثلاً تازگی عدم تکمیل اور شگفتگی کو انشائیے کے لیئے غیر معمولی اہم صفات سے تعبیر کیا ہے۔ اس ضمن میں وزیر آغا کے اس نقطۂ نظر کو بھی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے ان ادیبوں کو بھی پورے طور پر انشائیہ نگار ماننے سے انکار کیا ہے۔ جن کو عموماً تاریخی اعتبار سے انشائیہ نگاری کا پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے ان کا خیال ہے کہ :۔

"ناقدین ادب نے اردو ادب کے تاریخی اور تدریجی ارتقاء کو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں انشائیہ کے وجود کو ثابت کرنے کی دھن میں انہوں نے کسی قابل قدر تحقیقی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ہر قسم کے طنزیہ مضامین یا غیر شخصی سنجیدہ نگارشات کو انشائیہ کا نام دے کر محض خود کو تسلی دینے کی کوشش کی ہے۔ فی الواقع اردو میں تاحال انشائیہ کی صنف بطور ایک تحریک کے معرض وجود میں نہیں آئی" [1]

---

[1] انشائیہ کے خدوخال۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۴

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ وزیر آغا کی یہ رائے خاصی انتہا پسندی پر مبنی ہے حقیقت یہ ہے کہ کسی نثر پارے کا باقاعدہ انشائیہ ہونا ایک چیز ہے اور کسی فنکار کے نثر پاروں میں انشائیہ جیسے عناصر کی تلاش و جستجو دوسری چیز۔ انشائیہ کے ارتقاء کے طور پر انشائیہ کے حسن نقادوں نے محمد حسین آزاد، سرسید، خواجہ حسن نظامی یا اس نوع کے دوسرے نثر نگاروں کے مضامین میں انشائیہ کے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا مدعا سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جدید دور سے قبل سادگی، شگفتگی اور انشائیہ کا اسلوب کے عناصر ان نثر نگاروں کے یہاں کس انداز میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی صنف ادب کے ارتقائی مراحل اسی طرح طے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر تذکرہ نگاروں کے یہاں ہمیں تنقیدی عناصر مل جاتے ہیں تو ہم اردو تنقید کے پس منظر کے جائزے میں تذکروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے بالکل اسی طرح سے اگر سرسید کے کچھ مضامین مثلاً "امید کی خوشی" اور "محبت و تکرار" میں کچھ انشائیہ کی خصوصیات ملتی ہیں تو انہیں انشائیہ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے کہ " سرسید کے بیشتر مضامین میں سنجیدہ مباحث کا انداز ملتا ہے اور یہ کہ ان کے یہاں وہ تخلیقی تازگی نہیں ملتی جو انشائیہ کا بنیادی وصف ہے" مگر اس تصور میں سرسید کے مقالہ رجحان کو انشائیہ سے الگ بتایا گیا ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے بعض مضامین انشائیہ کا تاثر دیتے ہیں۔ راقم الحروف نے گزشتہ باب میں انشائیہ کے ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے جہاں سرسید کی نثر سے بحث کی ہے وہاں ان کے مخصوص چند مضامین کا حوالہ دیا ہے۔ انشائیہ نگاری کے اسلوب کو سرسید کا غالب رجحان نہیں بتایا گیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا سرسید کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم اور خواجہ حسن نظامی کے نام بھی لیتے ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ دونوں کے انداز انشائیہ نگاری کی صلاحیت تو ہے مگر انہوں نے اس صنف ادب کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا۔ انھوں نے اس ضمن میں یلدرم کے مضمون " مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کا ذکر بھی کیا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ مضمون اوریجنل نہیں ہے

اس سلسلے میں یہی عرض کر سکتی ہوں کہ یلدرم نے کسی ترکی یا انگریزی افسانے کا چربہ نہیں کیا ہو یا ذاتی طور پر کوئی انشائیہ نما تحریر لکھی ہو ان سب میں انشائیہ کی صفات ضرور پائی جاتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جب کسی تحریر کو انشائیہ کا واضح نام نہیں دیا گیا تھا اس وقت انشائیہ نما تحریروں سے ہی ہم انشائیہ کے مستقبل کا تعین کر سکتے تھے ــــــ

یلدرم کے علاوہ انشائیہ کے ارتقاء کے سلسلے میں وزیر آغا نے خواجہ حسن نظامی کی مثال دی ہے اور کہا ہے کہ ان کے یہاں بھی انشائیہ کی بعض اہم خصوصیات کا فقدان ہے وہ لکھتے ہیں کہ :-

> "خواجہ حسن نظامی کے یہاں بھی انشائیہ نویسی کا رجحان تھا اور وہ اہل انشائیہ نویس کی طرح زندگی کے بظاہر غیر اہم موضوعات پر قلم اٹھانے پر بھی مائل تھے (مثلاً مچھر وغیرہ پر ان کے مضامین) لیکن ان تمام مضامین میں انشائیہ کی دو اہم ــــــ خصوصیات کا فقدان ہے ایک تو ان مضامین کا لہجہ انشائیے کے لہجے سے ہم آہنگ نہیں دوسرے ان میں مصنف کی اپنی ذات اور شخصیت اجاگر نہیں ہوئی چنانچہ یہ مضامین انشائیے کے تحت شمار نہیں ہو سکتے"[1]

اس اقتباس سے وزیر آغا کی جو رائے سامنے آتی ہے اس سے ان کی اس تعریف پر اصرار ملتا ہے جو انھوں نے ذاتی طور پر انشائیے کے لئے متعین کر رکھی ہے جبکہ ڈاکٹر سید حسنین اور دوسرے انشائیے کے ناقدین مثلاً آدم شیخ وغیرہ انشائیے کو ایک ایسی لچکدار صنف بتاتے ہیں جس میں ایک سے زیادہ اسالیب کی گنجائش نکلتی ہے ۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تعریف پر یوں تو فرحت اللہ بیگ کے انشائیے اکثر پورے اترتے ہیں تاہم ان کو بھی باقاعدہ انشائیہ قرار دینے میں ڈاکٹر صاحب کو تکلف ہے وہ لکھتے ہیں کہ :-

> "فرحت اللہ بیگ کے یہاں وہ بہت سی باتیں ملتی ہیں جو انشائیہ کا امتیازی وصف قرار پا چکی ہے مثلاً شگفتہ انداز نگارش اور موضوع سے مصنف کا گہرا تعلق وغیرہ ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرحت اللہ بیگ کے یہاں بھی دوسرے کرداروں کی

---

[1] انشائیہ کے خد و خال ۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۵

معکاسی یا واقعات کا بیان ہی انشائیہ کا غالب عنصر ہے اور اسی لئے وہ ایجادات کے کسی گوشے کو عریاں نہیں کرتے۔ "نذیر احمد کی کہانی" اور "بھول والوں کی سیر" اردو ادب میں زندہ رہنے والی تخلیقات ضرور ہیں لیکن انہیں انشائیہ کے طور پر پیش کرنا بہت مشکل ہے" ۱؎

اس کا مطلب یہ ہے کہ وزیر آغا کے نزدیک فرحت اللہ بیگ بھی انشائیے کی تاریخ پر پورے نہیں اترتے جہاں تک مولانا ابو الکلام آزاد کی کتاب "غبار خاطر" کے انشائیہ نما خطوط کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں ڈاکٹر آغا صاحب نے نرم لہجہ اختیار کیا ہے اور ان کے بعض ٹکڑوں کو انشائیہ سے ہم آہنگ بتایا ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"غبار خاطر کے بعض ٹکڑے انشائیے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں مثلاً چڑیوں کے سلسلے میں مولانا موصوف کے تجربات یا قہوہ کے بارے میں ان کا مخصوص ردعمل، ان ٹکڑوں میں پرشکوہ اسلوب نگارش کی بجائے مولانا نے ایک ملکا پھلکا اور شگفتہ اسلوب اختیار کیا ہے جو انشائیے کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں کچھ زیادہ چیزیں تحریر نہیں کی۔ اگر وہ اس صنف کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوتے اور اپنی تحریروں سے انکشاف ذات کا کام بھی لیتے تو یقیناً انہیں انشائیہ کے ضمن میں ایک مقام امتیاز حاصل ہوتا" ۲؎

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا مولانا آزاد کی انشائیہ نگاری کی تمام خصوصیات کو تسلیم کرنے کے باوجود صرف انکشاف ذات کی کمی کے باعث ان کے باقاعدہ انشائیہ نگار ہونے سے انکار کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ غبار خاطر کے بعض خطوط میں یہ خصوصیت نہ ہوتی تو ہمارے نقاد ان کو خطوط ماننے سے انکار نہ کرتے اور انشائیہ کے ضمن میں بار بار غبار خاطر کے مکاتیب کا ذکر نہ ہوتا۔

۱؎ انشائیہ کے خدوخال ۔۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۵،۱۶
۲؎ " " " ۱۶

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں ہم سر سید، وحید الدین سلیم، فرحت اللہ بیگ اور پطرس وغیرہ
کو انشائیہ کی تاریخ کے بنانے والوں میں شمار کرتے ہیں وہیں ہمیں مولانا آزاد کے پر شکوہ اسلوب
اور انشائیہ نگاری کا اعتراف کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا چونکہ انشائیہ کی تعریف اور شرائط
کے معاملے میں سخت گیر ہیں اس لیے بڑی اہم انشائیہ نما تحریریں بھی ان کی نظر میں نہیں آتی۔ شاید
یہی وجہ ہے کہ طنزیہ اور مزاحیہ عناصر کی شمولیت سے تیار ہونے والے مضامین کو بھی وہ انشائیہ کے
دائرے سے خارج کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے عناصر کے ساتھ ساتھ طنز اور مزاح کے عناصر
انشائیہ کے مختلف پہلوؤں میں اضافہ ہی کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس نقطہ کو سامنے رکھتے ہوئے
ڈاکٹر آغا رشید احمد صدیقی کے یہاں کہیں کہیں انشائیہ کے تیور ڈھونڈ لیتے ہیں ــــ

اس جائزے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وزیر آغا کی سخت گیری انشائیہ کے سلسلے
میں بعض اہم انشاپردازوں کو بھی لائق اعتنا نہیں گردانتی۔ اپنی کتاب انشائیہ کے خدوخال میں
وہ بہت سے انشاپردازوں کا ذکر کرتے ہوئے نتیجہ نکالتے ہیں! ــــ

"دراصل انشائیہ کا پورے طور سے تجزیہ کیے بغیر ہر قسم کی مزاحیہ یا نیم مزاحیہ تخلیق
کو انشائیہ کا نام دے کر پیش کرنے کی جو روش ہمارے یہاں قائم ہوتی ہے وہ انشائیہ
کے فروغ اور ارتقاء کے لیے خطرہ ہے۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم
پہلے سنجیدگی سے انشائیہ کا مطالعہ کریں اس کی حدود کا تعین کریں اور پھر
اس میزان پر ہر اس ادبی تخلیق کو تولنے کی کوشش کریں جسے بطور انشائیہ
پیش کیا جائے۔ میری دانست میں انشائیہ کو فروغ دینے کا یہی ایک
احسن طریق ہے" [1]

وزیر آغا کے اس خیال میں جس قسم کی تنقیدی نکات سامنے آئے ہیں ان سے اس صنف نثر
کی حدود کا بھی تعین ہوتا ہے اور ایسی تحریروں کے چلن کے عام ہونے کی توقع بھی قائم ہوتی ہے
کہ جنکو انشائیہ کا سنگ میل شمار کیا جا سکے ــ

وزیر آغا نے اپنے مضامین میں فن انشائیہ اور انشائیہ نگاروں سے باقاعدہ طور پر بحث کی ہے

---

[1] انشائیہ کے خدوخال۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۷

ان کے کچھ مضامین تو انشائیہ کے فن کے بارے میں ہیں اور بعض مخصوص انشائیہ نگاروں کے بارے میں۔

ڈاکٹر آغا نے اپنے ایک مضمون "کچھ اردو انشائیہ کے بارے میں" میں لائٹ ایسیز، انشائے لطیف، ادبِ لطیف اور انشائیہ کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل سے جس طرح کے انشا پردازی کے نمونے یلدرم اور ان کے رفقا کے ذریعے سامنے آئے اور جس طرح کی نثر ٹیگور کی نثر کے زیرِ اثر لکھی گئی ان کو کن ناموں سے موسوم کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وزیر آغا نے مختلف ناموں کا ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ نثری نمونے پورے طور پر انشائیے کے ذیل میں نہیں آتے وہ لکھتے ہیں کہ:

"بیشتر لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ انشائیہ ادب کی مشکل ترین اور لطیف ترین صنف ہے اور یہ صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے جب زبان ارتقا کے بہت سے مراحل طے کر چکی ہے۔ اردو زبان کی ترقی اور فروغ کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اس میں انشائیہ نے جنم لے لیا ہے تو اس کی حیثیت خودرو گلاب سے کچھ ایسی مختلف نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مشتاق ہاتھ اسے سنواریں اس کی کانٹ چھانٹ کریں اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے فاصل قوت عطا کریں ۔۔۔۔۔۔ اس لئے کہ اردو ادب میں انشائیہ ایک نامیاتی کل کی حیثیت سے تازہ تازہ نمودار ہوا ہے" [1]

اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک طرح سے انشائیہ کا سرمایے کی نشاندہی بھی کی ہے اور آزادانہ طور پر انشائیے کے حدود کا تعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے جس میں ان کا اصرار اس بات پر ہے کہ جو ادیب بھی تخلیقی ذہن کے مالک ادیب اس طرف توجہ دیں گے اسی قدر اس صنف کے مختلف عناصر نمایاں ہوتے چلے جائیں گے وہ کہتے ہیں کہ اردو کے نثری سرمایے میں جو انشائیہ کا نمونے ملتے ہیں ان میں مرزا غالب کے خطوط اہم ہیں ان میں اسلوب کی شگفتگی اور انکشافِ ذات کے عناصر کی وجہ سے کم و بیش انشائیہ کی شان پائی جاتی ہے۔ مگر ڈاکٹر آغا ان خطوط کو انشائیے کے سرمایے میں باقاعدہ شامل کرنے کے طرفدار نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ مرزا غالب کے یہ نامے (گو قیامت کے ہیں) آخر خطوط ہی تو ہیں۔ اسی طرح سے وزیر آغا نے سرسید کے بعض مضامین کی بھی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ سرسید کے اندر چھپے ہوئے انشائیہ نگار نے

---

[1] انشائیہ کے خدوخال ۔ ڈاکٹر وزیر آغا (کچھ اردو انشائیہ کے بارے میں) صفحہ ۲۰

ان مضامین میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش تو جگہ جگہ کی ہے لیکن سر سید کے اندر چھپے ہوئے مصلح نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ سر سید اور مرزا غالب کے علاوہ خواجہ حسن نظامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی نظر عموماً خارجی چیزوں پر ہی رہی اور وہ اپنی ذات کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اتار نہ سکے چنانچہ ان کے مضامین بھی انشائیہ نہیں بن پائے۔ ان ادیبوں کے علاوہ ڈاکٹر آغا نے متعدد مضامین میں مولانا ابوالکلام آزاد سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے جس کے حوالے گذشتہ صفحات میں آچکے ہیں۔ تاہم ان باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ انشائیہ میں تخیل بھی ہو سکتی ہے۔ طنز و مزاح بھی ہو سکتا ہے اور شگفتگی اور انکشاف ذات بھی، مگر یہ عناصر انشائیے کے تشکیلی عناصر ہیں۔ ان میں سے کسی ایک خوبی کی بنیاد پر نثر پارے کو انشائیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی صرف شگفتگی کی وجہ سے کوئی نثر انشائیہ نہیں ہو سکتی تو صرف طنز و مزاح کی وجہ سے بھی انشائیہ نہیں ہو سکتی۔ ان کے الفاظ میں کہ :-

"یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ میں مزاح یا طنز شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ صرف اس قدر کہ طنز یا مزاح کی حیثیت محض ایک ذریعے کی ہے اور اس لیے جب ذریعہ کو مقصد کا درجہ دے دیا جائے اور زندگی کے کسی مبہم تاریک گوشے کو منور کرنے کا رجحان معدوم ہو جائے تو انشائیہ کی صورت ہی مسخ ہو جاتی ہے۔" [1]

وزیر آغا کے مندرجہ بالا نقطۂ نظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کسی ایک خوبی کو انشائیہ کا لازمی حصہ نہیں تصور کرتے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ انشائیہ کو پڑھ کر قاری کی زندگی کا کوئی مبہم تاریک گوشہ منور ہو جائے۔

اس سلسلے میں انہوں نے طنز و مزاح اور انشائیے کی بحث اپنے چوتھے مجموعے (انشائیہ) "سمندر اگر میرے اندر گرے" کے پیش لفظ بعنوان "اردو انشائیہ کی کہانی" میں بھی اٹھائی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ طنزیہ مضامین انشائیہ کے خانے میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو انشائیہ کے لفظ کی توقیر بڑھ جانے کی وجہ سے ہر طنزیہ اور مزاحیہ مضمون پر انشائیہ کا لیبل لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر انشائیہ کا لیبل لگانا دراصل انشائیہ نگاری کے پورے رجحان کو دریا برد کر دینے کے مترادف ہے کہ :-

"ہم نے بہت سے معتبر طنز و مزاح نگاروں کی نگارشات کو انشائیہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ملکہ جن کے تتبع میں انہوں نے اپنے مضامین لکھے تھے مثلاً کیو اور لیمس اور

---

[1] انشائیہ کے خدوخال۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ (کچھ اردو انشائیہ کے بارے میں) صفحہ ۲۱

رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی وغیرہ۔ ان حضرات کے سلسلے میں بھی اس بات کا برملا اظہار کردیا کہ اپنے خاص میدان میں تو ان ادبا کی اہمیت مسلم ہے مگر انہیں کسی صورت میں بھی انشائیہ نگار تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔[۱]

اس تصور سے ڈاکٹر وزیر آغا کی بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ مضامین بالخصوص پطرس اور رشید احمد صدیقی اور کپور وغیرہ کے ظرافتیہ مضامین پورے طور پر انشائیہ کے تحت نہیں لکھے جا سکتے۔ اپنے اسی مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کے بہت سے مسائل کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انشائیہ نما مضامین کو اگر تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم ہند کے بعد لکھے جانے والے مضامین کو الگ الگ خانے میں رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ سر سید احمد خاں کے مضامین سے لیکر تقسیم ملک تک لکھے گئے مضامین کے انبار میں کوئی ایسی تحریر موجود نہیں ہے جسے مکمل انشائیہ کا نام دیا جا سکے۔

اس لئے وزیر آغا کا خیال ہے کہ انہوں نے جب انشائیہ کے لفظ کا بار بار استعمال کیا اور انشائیہ نگاری کو ایک تحریک بنانے کی کوشش کی اس وقت تک جو مضامین انشائیے میں شمار کئے جاتے تھے وہ صحیح مضمون میں انشائیہ نہیں تھے وہ کہتے ہیں کہ :-

"ادھر ہم نے پرسنل ایسے کے لئے انشائیہ کا لفظ تجویز کیا اور ادھر یار لوگوں نے اس لفظ کو ساری ہی غیر افسانوی نثر کے لئے مختص کرنا شروع کر دیا۔ بس سارا جھگڑا یہیں سے شروع ہوا تھا"[۲]

ڈاکٹر وزیر آغا نے چونکہ انشائیہ نگاری کو اپنے مضامین اور اپنے رسالے میں ایک تحریک کے طور پر اپنایا تھا اس لئے ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان کے رسالے اوراق کی تحریک سے پہلے انشائیہ نما جو چیزیں بھی لکھی گئیں ان میں بعض چیزیں تو یقیناً انشائیہ میں شامل ہیں۔ لیکن غیر افسانوی نثر کے مختلف نمونوں کو جس طرح عام لوگ انشائیہ سمجھنے لگے ہیں اس سے وہ اتفاق نہیں کرتے وہ بار بار اس تحریک کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں اور اوراق میں جو انہوں نے "سوال یہ ہے" کے عنوان سے جو انشائیہ کی بحث اٹھائی تھی اس کو انشائیہ نگاری کی تاریخ کا اہم کارنامہ قرار دیتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اوراق میں جاری انشائیہ کی بحث نے نئے لکھنے والوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا کر دیا تھا جنہوں نے عملی طور پر

۱۔ "سمندر اگر میرے اندر گرے" ڈاکٹر وزیر آغا (پیش لفظ) صفحہ ۸

۲۔ مضمون اردو انشائیہ کی کہانی۔ "انشائیہ کے خدوخال"۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۸۴

انشائیہ نگاری کی کوشش کیں۔ ان لکھنے والوں میں کامل القادری، اکبر حمیدی، محمد اقبال انجم، راجہ لعل ماہوی، طارق جامی، امجد طفیل، محمد منشا یاد، نقی حسین جعفری، بشیر سیفی، شمیم ترمذی اور راغب شکیب کے علاوہ بہت سے سینیئر ادیب مثلاً جوگندر پال، احمد جمال پاشا، غلام الثقلین نقوی، مشتاق احمد اور ارشد میر بھی اوراق کی ان سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ ان لوگوں کے علاوہ دوسرے گروہ کے انشائیہ نگاروں میں نظیر صدیقی اور سلیم اختر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے جو مضامین لکھے ان مضامین کی تائید میں انور سدید نے بھی پہلے تو متفرق مضامین لکھے اور اس کے بعد جب انشائیہ کے خلاف محاذ آرائی شروع ہوئی تو ڈاکٹر سدید نے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اس کتاب کی پذیرائی ڈاکٹر وزیر آغا ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "انشائیہ اردو ادب میں" لکھ کر انشائیہ کی پوری تاریخ کو سمیٹ لیا اور انشائیہ کے سارے خدوخال اس شرح وبسط کے ساتھ متعین کر دیئے کہ لکھنے والوں کے نوجوان طبقے کی تربیت ہونے لگی اور اب وہ کھلے الفاظ میں بعض طنزیہ مزاحیہ لکھنے والوں کے انشائیہ نگار ہونے کے دعووں کو مسترد کرنے لگے ہیں۔"[1]

انور سدید کے اس کارنامے کے اعتراف کے باوجود یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ انشائیہ کی تحریک میں سب سے نمایاں نام بلکہ محرک کی حیثیت ڈاکٹر وزیر آغا کو ہی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اسی زیر بحث مضمون میں انشائیہ کی بہت جامع تعریف کرنے کی کوشش کی ہے شاید اس تعریف پر غور کرنے کے بعد انشائیہ پر وزیر آغا کا حوالہ بھی ایک ساتھ سامنے آجائے اور مزید کسی بحث کی گنجائش نہ رہے :-

"انشائیہ ایک ایسی نثر اصناف ادب کی صنف ہے جو قاری کو ذہنی فرحت، فطری لطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے اس لیے میں اسے امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ، شعر کی

---

[1] مضمون اردو انشائیہ کی کہانی مشمولہ انشائیہ کے خدوخال۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۹۰-۸۹۔

لطافت اور سوز نامے کا فکری محرک بلکہ جا ہو گئے ہیں۔ تاہم انشائیہ محض ان اوصاف
کی حاصل جمع کا نام نہیں وہ ان سب کو اپنے اندر جذب کرکے خود ایک ایسی اکائی
بن کے نمودار ہوتا ہے جس کی انفرادیت ان جملہ اوصاف کی حاصل جمع
سے کچھ زیادہ ہوتی ہے" ۱؎

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اس تعریف میں ڈاکٹر وزیر آغا نے مماثل اضافے سے انشائیہ کی مماثلت اور اختلاف دونوں واضح کر دیئے ہیں۔ اس تعریف کے بعد مزید کسی بحث کی گنجائش بہت ہی کم رہ جاتی ہے ــــــــــ

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کے صنف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا سلسلہ انہوں نے ختم نہیں کیا بلکہ نئے تصورات اور نئے علمی مباحث کے ساتھ ساتھ انشائیہ پر ان کے غور و خوض کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ پچھلے دنوں ان کا ایک مضمون ہر رسالہ شاعر (بمبئی) میں "انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اپنے پرانے تصورات کا حوالہ دیتے ہوئے کچھ نئی باتیں بھی کہیں ہیں۔ اس مضمون میں وزیر آغا طنز و مزاح کے مقابلے میں بھی انشائیہ کے امتیازات کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:ــــــ

"انشائیہ میں انشاء کا عنصر بجائے خود اس بات پر دال ہے کہ انشائیہ اسلوب
کی تازگی پر زور دینا چاہتا ہے اور اس کام کے لیے وہ مزاح اور اس سے
اماثل کے علاوہ تشبیہ، استعارہ نیز اس سارے مواد کو بقدر ضرورت
استعمال کرتا ہے جو اچھی ادبی نثر کا امتیازی وصف ہے" ۲؎

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے کی تحریروں کے مقابلے میں وزیر آغا کے خیالات میں توازن پیدا ہوا ہے اور انہوں نے اپنے پسندیدہ انداز نگارش کے علاوہ ہر چیز کو انشائیہ کے دائرے سے خارج کرنے کا رویہ تبدیل کیا ہے۔ پہلے وہ طنزیہ اور مزاحیہ عناصر والے انشائیوں کو کسی بھی طرح انشائیہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے لیکن اب وہ انشائیہ کی صنف کے دائرے کو پھیلانا چاہتے ہیں اور اس میں شدت کا انداز اختیار نہیں کرتے، انہوں نے

۱؎ مضمون اردو انشائیہ کی کہانی۔ مشمولہ انشائیہ کے خدوخال۔ ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۹۵
۲؎ رسالہ شاعر شمارہ نمبر ۲ جلد نمبر ۶۶ صفحہ نمبر ۶

اپنے اس مضمون کا اختتام جن الفاظ میں کیا ہے اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وزیر آغا انشائیہ پر ہونے والے رد عمل کا خاص خیال رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں :۔

"انشائیہ اور اردو انشائیہ نے جو شدید رد عمل پیدا کیا ہے وہ اب سامنے کی بات ہے۔ تاہم اس رد عمل میں مضمر بغض یا نفرت کی زیریں لہر کا احساس زیادہ لوگوں کو نہیں ہے۔ مگر اب وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب رد عمل کا یہ شخصی پہلو قاری پر عیاں ہو جائے گا جب ایسا ہوا تو انشائیہ کے فروغ کے راستے میں آخری رکاوٹ بھی باقی نہیں رہے گی"[1]

---

[1] رسالہ شاعر شمارہ نمبر ۲ جلد نمبر ۴۹ صفحہ ۱۱ "انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری" ڈاکٹر وزیر آغا

چوتھا باب

وزیر آغا کی انشائیہ نگاری

کا

تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ

اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ میں اسکیچ، مضامین اور تاثراتی خاکے تو یقیناً اس سے زیادہ ہیں کہ انشائیہ کی تاریخ تقریباً پوری ایک صدی پر پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ہم انشائیہ کی اصطلاح کو صحیح معنوں میں اپنائیں اور اس نقطۂ نظر سے خاکوں میں تاثراتی مضامین اور انشائیہ نما نثر پاروں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کی تحریروں کو شروع میں انشائیہ کا نام نہیں دیا گیا تھا جیسا کہ وزیر آغا نے جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ سید محمد حسین نے خود انہوں نے اس طرح کے مضامین کو سب سے پہلے انشائیہ کی اصطلاح کا نام دینے کی کوشش کی۔

یوں تو اس زمانے میں ان گنت ایسے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو انشائیہ نگار قرار دیتے ہیں اور تنقیدی اصطلاح کے مطابق بھی انشائیے کی صف کو خاکہ، ادب لطیف، طنز و مزاح اور دوسری طرح کی عام نثر سے الگ قرار دیتے ہیں اس اعتبار سے دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ انشائیے کے فن پر سب سے پہلی کتاب سید محمد حسنین نے لکھی لیکن انشائیہ نگاری کو ایک عام نثری رجحان بنانے کا اور اس کو مقبولیت دینے کا سہرا صحیح معنوں میں ڈاکٹر وزیر آغا کے سر بندھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف انہوں نے ذاتی طور پر انشائیے لکھے بلکہ انشائیہ نگاری کو اپنے رسالے "اوراق" کے ذریعے مقبول بنانے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے اپنے رسالے میں بار بار اس موضوع پر اداریے لکھے۔ اس صنف ادب کے بارے میں مختلف بحثیں شائع کیں۔ انشائیہ نگاروں کے انٹرویوز چھاپے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہر شمارے میں مختلف نئے اور پرانے لکھنے والوں کے انشائیے اہمیت کے ساتھ شائع کیے۔

یہ جائزہ تو گزشتہ باب میں لیا جا چکا ہے کہ خود ڈاکٹر وزیر آغا انشائیے کے فن کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور مختلف اوقات میں انہوں نے کس طرح اس موضوع پر اپنے بیانات دیے ہیں چونکہ زیر بحث باب کا موضوع وزیر آغا کے انشائیوں کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ ہے اس لیے اس باب کی ساری گفتگو ان کے انشائیوں پر مرکوز ہوگی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ خیال پارے کے نام سے 1961ء میں چھپا۔ اس کی اشاعت سے کئی سال پہلے سے وزیر آغا انشائیے لکھنے اور شائع کرانے لگے تھے انہوں نے ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ

"میں ۱۹۵۰ سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصے میں ادب لطیف میں متعدد غیر مسلسل اسکیچ تحریر
کئے جنہیں لائٹ اسکیچ، انشائے لطیف، لطیف پارہ، مضمون پارہ وغیرہ کے ناموں سے
شائع کیا گیا تھا۔"؂۱

اس وقت وزیر آغا نے ان اسکیچز کو خود ہی انشائیے کا نام نہیں دیا تھا لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ انگریزی لفظ Essay کا اگر کوئی اردو متبادل ہے تو وہ انشائیہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس اصطلاح کو باقاعدہ اپنا لیا اور اپنے سارے مضامین (Essays) کو انشائیوں کے نام سے شائع کیا۔ خیال پارے میں ایک اہم انشائیہ پگڈنڈی کے نام سے موسوم ہے اس میں وزیر آغا نے بے تکلفی کے ساتھ بعض نہایت خوشگوار اور دلچسپ باتیں کہنے کی کوشش کی ہیں۔ بس اس بات کا خیال رکھا ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس کا بنیادی حوالہ پگڈنڈی ہو یا دوسرے الفاظ میں پگڈنڈی کے موضوع سے اس کا کوئی رشتہ قائم ہوتا ہو۔ اگر اس موضوع پر ایک عام سا مضمون لکھا جاتا تو اس میں سیدھے سادھے انداز میں پگڈنڈی کی خصوصیات کا ذکر کیا جاتا یا اس کی تعریف کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس کے بعد دوسری باتیں کی جاتیں گی۔ مثلاً اس طرح کہ پگڈنڈی کھیتوں کے بیچ میں ہوتی ہے یا پگڈنڈی سڑک سے بچ کر چھوٹے چھوٹے راستے کو کہتے ہیں۔ عام انداز تحریر کے برعکس اس انشائیہ میں افسانہ یا مضمون کی ہیئت سے الگ ہٹ کر آزادی کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کی گئی ہیں۔

پگڈنڈی یوں تو ایک عام سا لفظ ہے لیکن اس انشائیہ کو پڑھ کر لگتا ہے کہ پگڈنڈی کے تصور نے مصنف کے دماغ میں یہ تحریک پیدا کی کہ اس کو انشائیہ کا موضوع بنایا جائے جب انہوں نے اس موضوع پر غور کیا تو ان کو اندازہ ہوا کہ پگڈنڈی انسانی مزاج سے بہت ملتی جلتی ہے اور پگڈنڈی میں بہت سی ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جن کا عکس ہمیں انسانی مزاج میں دکھائی دیتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر آغا لکھتے ہیں:

"بعض لوگ جرأت رندانہ کا ثبوت دینے کے لئے سڑک کو چھوڑ کر پگڈنڈی
اختیار کرتے ہیں لیکن اپنے قفس کی تیلیوں سے یہ لوگ اس قدر مانوس ہوتے ہیں
کہ انہیں پگڈنڈی کی دنیا راس نہیں آتی اور وہ بھاگ کر سڑک کی آغوش
میں پھر سے پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"؂۲

جب ایک انسان اپنی مرضی سے پگڈنڈی کا انتخاب کرتا ہے تو اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس

؂۱ سمندر اگر میرے اندر گرے (پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا) صفحہ ۸

؂۲ خیال پارے۔ ڈاکٹر وزیر آغا (پگڈنڈی) صفحہ ۲۳۔۲۲

انتخاب میں اس کی مرضی کو زیادہ دخل ہے جس طرح ایک انسان جب اپنے مستقبل یا ماضی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے تو پتہ نہیں وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سڑک پر چلنے والا آدمی پگڈنڈی کو کبھی اختیاری انداز میں اور کبھی بے اختیارانہ انداز میں چلنے کے لئے منتخب کر رہا ہے۔ اس انشائیہ میں پگڈنڈی کی علامتی حیثیت بھی ہے اس لئے کہ انسان روز بروز ترقی کی دوڑ میں اتنا آگے نکلتا جا رہا ہے کہ اس سے فطری چیزیں دور ہوتی جا رہی ہیں اس لئے اگر انسان زمین آسمان اور چاند ستارے کے ساتھ ساتھ اپنے کھیتوں اور پگڈنڈیوں سے بھی رابطہ رکھے تو اس کو فطرت کی آغوش میں پلنے اور فطرت سے قریب رہنے کا لطف اٹھا سکتا ہے فطرت کے تقاضوں کو اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے اور دنیا کے ہنگاموں میں مصروف اور بھیڑ چال چلنے والے لوگوں سے ہٹ کر محسوس کیا جائے اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا جائے تو ایسے آدمی کو پگڈنڈی اپنے زندگی سے زیادہ قریب معلوم ہوگی

"انسان کا دل بالکل ایک جنگل کی مانند ہے اس کی آواز اسی وقت سنائی دے گی جب آپ اپنے ہونٹوں پر قفل لگا لیں گے اور شور و شغب سے دور ہٹ کر ایک لحظے کے لئے ساکت ہو جائیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر بڑے اوتار پیغمبر یا فن کار نے دل کی آواز کو سننے کے لئے سب ہی مارو نق سڑک کو ترک کر کے اپنے لئے ایک خاموش سی پیچ و تاب کھاتی ہوئی پگڈنڈی دریافت کی ہے" [1]

انشائیہ پگڈنڈی میں وزیر آغا نے موضوع کی شگفتگی اور تازگی کو تو برقرار رکھا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ لفظوں کا استعمال بھی اتنی خوبصورتی سے کیا ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور قاری اپنے آپکو پگڈنڈی کی فضا میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔

انشائیہ کا اختتام کرتے ہوئے وزیر آغا نے بتانے کی کوشش کی کہ دنیا میں جتنے بھی عظیم لوگ پیدا ہوئے ہیں انہوں نے سڑک کی عام شاہراہ سے الگ ہو کر اپنے غور و فکر کے مطابق پگڈنڈی کا انتخاب کیا ہے یہی وجہ ہے وہ دوسروں سے عظیم کہلائے اور منفرد بھی ــــ

اب ذرا غور کیجئے کہ کس طرح بڑے بڑے اوتار پیغمبر اور فن کار کے لئے انشائیہ نگار نے عام روش سے ہٹ کر چلنے کو ایک الگ پگڈنڈی پر چلنے سے تعبیر کیا ہے یہیں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک انشائیہ نگار اپنے موضوع کو

---

[1] خیال پارے — ڈاکٹر وزیر آغا (پگڈنڈی) صفحہ ۲۴

آزادانہ طور پر اظہارِ خیال کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ مگر ساتھ ہی تخلیقی سطح سے تشبیہات اور استعاروں کا بھی استعمال کرتا ہے۔

اگر توجہ سے دیکھیے تو آپ کو وزیر آغا کے چھوٹے سے انشائیہ "پگڈنڈی" میں یہ تمام خوبیاں مل جائیں گی۔ خیال کی ندرت بھی ہے تشبیہات بھی ہیں اور آزاد خیالی بھی۔ اس طرح یہ انشائیہ وزیر آغا کے انشائیوں میں سے ایک نمونہ انشائیہ کہلانے کا مستحق بن گیا ہے۔

وزیر آغا کے انشائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اگر ترتیب وار ایک ایک انشائیہ کو زیرِ بحث لایا جائے تو اس طریقِ کار کو اپنانے میں اچھے اور برے کی تمیز کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خوف بھی ہے کہ ان کے اہم انشائیوں کے ساتھ حالانکہ انصاف نہیں ہو پائے گا اس لیے زیرِ بحث باب میں کوشش کی جائے گی کہ وزیر آغا کے ہر مجموعے کے اہم انشائیوں کا تجزیہ کیا جائے اور ان تجزیوں کی روشنی میں انشائیہ نگار کی حیثیت سے ان کی اہمیت متعین کی جائے۔

خیال پارے میں پگڈنڈی کے علاوہ ایک اہم انشائیہ "بہادری" بھی شامل ہے جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ بہادری ایک ایسی انسانی صفت ہے جس کے اظہار کے لیے جرأت اور بے خوفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی بہادر آدمی انجام سے بھی بے پروا ہو کر اپنی اس خوبی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ عقل و شعور کے ساتھ ساتھ انسان میں ایک طرح کی بزدلی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ تہذیب اپنے ساتھ جہاں بہت سی برکتیں لاتی ہیں وہیں اس کے ساتھ ساتھ کچھ کمزوریاں بھی آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر مہذب اور دانش مند آدمی ایسی باتوں سے پرہیز کرتا ہے جو بہادری کے پرانے تصور پر پوری اتر سکے وزیر آغا اپنے انشائیہ بہادری میں لکھتے ہیں۔

> "جتنا باشعور اور مہذب کوئی فرد ہوگا اتنا ہی وہ بہادری سے بیزار اور بزدلی کا گرویدہ ہوگا اور کبھی کسی بے لگام جذبے کے تحت کسی ایسی حرکت کا مرتکب نہ ہوگا جس پر بعد ازاں اسے پشیمان ہونا پڑے۔" [۱]

وزیر آغا نے اپنے اس انشائیے میں بہادری اور بزدلی کے فرق کو بہت خوبصورت انداز میں واضح کیا ہے وہ ایک طرف تو بہادری کو ایک نا تراشیدہ جذبہ کہتے ہیں اور دوسری طرف یہ بتاتے ہیں کہ انسان نے خوش اسلوبی کے

---

[۱] خیال پارے ڈاکٹر وزیر آغا (بہادری) صفحہ ۲۶

ساتھ ساتھ ریاکاری سیکھ لی ہے۔ یہ انشائیہ ایک طرف مصنف کے تجرباتی ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔ تو دوسری طرف طنزیہ لہجے میں انسانی تہذیب کی مضحکہ خیز چیزوں کا بھی بیان کرتا ہے۔ وہ بڑی خوبصورتی سے ایک غیر مہذب بیوی اور مہذب شوہر کی کشمکش کا ذکر کرتے ہیں۔

"جب کوئی غیر مہذب اور تنومند بیوی اپنے دبلے پتلے مہذب اور منحنی شوہر پر طنز و مزاح کے علاوہ بعض دوسرے غیر مہذب حربے استعمال کرے گی اور شوہر جوابی حملہ کرنے کے بجائے ہوشیاری کی کارروائی کا ایک ابدی سکوت سے جواب دیگا۔ تو ہم بیوی کی جرأت کو محض ایک حیوانی عمل قرار دیں گے اور شوہر کے انکسار اور تہذیب کو انسان کے ذہنی ارتقاء کا ادنیٰ کرشمہ کہیں گے"[1]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ تہذیب آدمی کو کیسا دکھ دکھاؤ سکھاتی ہے اور غیر مہذب ہونا کیسی جرأت کی علامت بن جاتا ہے۔

وزیر آغا نے اپنے پورے انشائیے میں اسی نکتہ کو اجاگر کیا ہے اور تاریخ کے مختلف ادوار کی طرف اشارے کرتے ہوئے طنزیہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ بھلا بتائیے کہ اس سے بہتر طنز کیا ہو سکتا ہے کہ بہادری کے عنوان سے لکھے ہوئے انشائیے کا اختتام ان جملوں پر کیا جائے۔

"پس چونکہ دنیا میں ترقی کرنے کے لئے زمانے کے مسلمات کو قبول کرنا ضروری ہے اس لئے آپکا فرض ہے کہ آپ بہادری جیسے فرسودہ اور کہنہ جذبے کو خیرباد کہہ کر انسانی فراست اور تدبر کے حق میں آواز بلند کریں اور انسان کے گرتے ہوئے اخلاق اور اپنی بزدلی کو اصول مصلحتوں سے سہارا دینے کی پوری سعی کریں اسی میں آپ کا اور نسل انسانی کا بھلا ہے"[2]

اس طنزیہ انداز سے یہ سمجھنا چاہیے کہ وزیر آغا نے بہادری کے خلاف کوئی بات کہی ہے یا وہ بزدلی کے طرفدار ہیں بلکہ ہر طنزیہ تحریر کی طرح اس تحریر میں بھی ہمیں بالکل الٹا مطلب نکالنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مہذب لوگوں کی بزدلی پر طنز کر رہے ہیں۔ وہ آخر میں لکھتے ہیں کہ "اسی میں ہمارا اور نسل انسانی کا بھلا ہے" تو دراصل وہ کہنا چاہتے ہیں کہ نسل انسانی کا بھلا اس میں نہیں ہو سکتا کہ آدمی عمل اور تہذیب

---

[1] خیال پارے ۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۔ صفحہ ۲۷

[2] " " صفحہ ۲۸

کے ساتھ ساتھ بزدل ہوتا چلا جائے ۔

اس انشائیہ میں اختصار کی صفت بھی ہے اور منفرد مزاج کی چاشنی بھی اگر فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وزیر آغا نے اپنے انشائیے کے فن کو کمال کے درجے تک پہنچا دیا ہے ۔

ڈاکٹر آغا کا ایک اہم انشائیہ "خاموشی" ہے۔ اس انشائیے میں انہوں نے انشائیے لکھنے کے عام انداز سے بالکل مختلف طریقہ اختیار کیا ہے انہوں نے خاموشی کے فائدے یا نقصان کو واضح لفظوں میں بیان کرنے کے بجائے اشارے اور کنائے میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس انشائیے میں کسی بیماری کی وجہ سے اپنی آواز کے رک جانے کو بنیاد بنایا گیا ہے اور اس بنیاد پر باہر کی دنیا میں ہونے والے شور اور ہنگامے پر تنقید کی ہے مصنف نے سننے اور بولنے کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے اور سننے کو خاموشی سے اور بولنے کو آواز سے تعبیر کیا ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں

" جب گویائی کی جگہ سماعت نے لے لی تو سب سے پہلے کائنات میں آواز کی فراوانی کا احساس ہوا۔ پھر یہ خیال آیا کہ آخر اتنی ساری آواز کی ہمیں ضرورت ہی کیا ہے ؟ مجھے اس ڈاکٹر کا قول یاد آیا جس نے کہا تھا کہ ہمارے معدوں کو اتنی غذا کی ہرگز ضرورت نہیں جتنی ہم انہیں فراہم کرتے ہیں غالباً یہی حال آواز کا ہے ہمیں اتنا بولنے کی ہرگز ضرورت نہیں جتنا ہم بولتے ہیں " سلہ

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ خاموشی جب آواز کے مخالف عمل کے طور پر سامنے آتی ہے تو کس قدر بامعنی ہو جاتی ہے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ دانشمند اور سمجھدار لوگ کم بولتے ہیں اور بے عقل لوگ اپنی زبان اور آواز کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ " زیادہ بولنے والے اپنی ذہنی مفلسی کی غمازی کرتے ہیں " وزیر آغا نے اسی لئے بھی " خاموشی " کا دفاع کیا ہے کہ خاموشی میں غور و فکر بھی کیا جا سکتا ہے اور علمی اور فکر انگیز باتیں بھی سوچی جا سکتی ہیں وہ لکھتے ہیں

" میں نے اس دن روز میں معمول سے کچھ زیادہ ہی سوچ بچار کی ہے۔ عام حالات میں تو خیال کی پیدائش اور زبان کی جنبش میں کوئی وقفہ حائل ہی نہ ہوتا تھا مگر اب عالم جیسا تھا یہاں ہر لمحہ نئے سے نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے " ۲ے

سلہ خیال پارے ڈاکٹر وزیر آغا (خاموشی) صفحہ ۳۱

سلہ " " " "

ہر بات میں بات پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے جو انشائیہ نگاری کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وزیر آغا نے اپنے دوسرے انشائیوں ہی کی طرح اس انشائیے میں بھی زیادہ تر باتیں ذاتی حوالے سے کی ہیں وہ کبھی کسی ادبی مسئلے کو یاد کرتے ہیں اور کبھی کسی فلسفیانہ نکتے کا خیال ان کی فکر کو آگے بڑھاتا ہے۔ پورے انشائیہ کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک خود کلامی کی کیفیت شروع سے آخر تک جاری ہے اور انشائیہ نگار کم سے کم لفظوں میں اپنی خوش مزاجی اور شگفتگی کے جوہر دکھا رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ انشائیہ "خاموشی" عام انشائیوں سے الگ بھی نظر آتا ہے اور دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔

وزیر آغا کا ایک قابلِ توجہ انشائیہ "آندھی" ہے۔ آندھی دراصل شخصیت کی تکمیل، اپنے باطن میں غور و فکر اور ناسازگار حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک بہترین ذریعہ بھی ہے اور وسیلہ بھی۔ آندھی کے تیز جھونکے انسان کو اس کے ماحول اور بیرونی مظاہر کے تمام رشتوں سے منقطع کر کے اسے اپنے اندر سمٹنے اور اپنی انا کو پہچاننے اور احساس و شعور کی شمع کو روشن کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وزیر آغا آندھی کے اس وصف اور کمال پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"یہی آندھی کا سب سے بڑا کمال ہے کہ یہ آپ کی توجہ کو بیرونی مظاہر سے ہٹا کر اندر کی رگ رگ پر مبذول کرا دیتی ہے اور آپ کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں مدد دیتی ہے"[1]

آندھی سے بظاہر انسان کی عافیت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور انسان کا بیرونی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "وہ جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی اس کی حالت قابلِ رحم اور اس کی ذہنی صحت بھی محلِ نظر ہے"[2]

وزیر آغا کا انشائیہ آندھی صرف ظاہری صورت حال میں دکھانا نہیں بلکہ وزیر آغا نے آندھی کو استعاراتی طور پر استعمال کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آندھی کس کس طرح سے انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ظاہری صورت حال سے مراد یہ ہے کہ آندھی ایک تیز و تند ہوا ہوتی ہے اس کے جھونکے اتنے شدید ہوتے ہیں کہ ہر چیز برباد اور تہس نہس ہو جاتی ہے اور اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کے سینکڑوں مناظر چھوڑ جاتی ہے۔ آندھی کے حوالے سے وزیر آغا غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ وزیر آغا کا کہنا ہے کہ آندھی انسان میں تحریک پیدا کرتی ہے

---

[1] خیال پارے ڈاکٹر وزیر آغا (آندھی) صفحہ ۴۵
[2] ،، ،، ،، ،، ۴۲

وزیر آغا دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اندھی کے ذریعے ہم تصنع، بناوٹ اور فریب کو ختم کر سکتے ہیں اور اس کے بعد جو اصلیت ہمارے سامنے آئے گی وہ یقیناً سبق آموز ہوگی۔

وزیر آغا نے دوسرے انشائیوں کی طرح اس انشائیہ میں بھی شگفتگی، تازگی اور لطافت کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔

وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ "خیال پارے" بنیادی اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ اسی مجموعے کا ایک اہم انشائیہ "ریلوے ٹائم ٹیبل" ہے۔

وزیر آغا نے معمولی موضوعات کو اپنے انشائیوں میں جگہ دی اور ان پر شگفتہ انشائیے لکھے ہیں۔ "ریلوے ٹائم ٹیبل" پر انشائیہ لکھ کر اسی تخلیقی صلاحیت سے اسے جاوداں بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے "ریلوے ٹائم ٹیبل" کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے

"ریلوے ٹائم ٹیبل ایک ایسی کتاب ہے جو فرد کو بستر پر لیٹے لیٹے لمبے سفر کے مزے سے آشنا کرتی ہے" [1]

چونکہ انسان کی فطرت تلون آشنا ہے وہ بہت دنوں تک کسی ایک حالت یا ایک مقام پر رہنا پسند نہیں کرتا، ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے اور اسی میں اس کی ترقی کی ضمانت بھی ہے ریلوے ٹائم ٹیبل دراصل انسان کے اسی فطری تقاضے کی ایک علامت ہے، جو سفر کے پروگرام کی نشاندہی کرتا ہے انسان جب تہذیب سے بیگانہ تھا اس وقت قوم اور وطن کے تصورات ہمارے ذہن میں نہ تھے انسان اپنے اس فطری تقاضہ کی بہ آسانی تکمیل کر لیتا تھا اب ان چیزوں نے انسان کے لیے بہت دشواریاں اور معنوی حد بندیاں پیدا کر دی ہیں اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں

"پھر تہذیب کا آغاز ہوا، زمین سے وابستگی پیدا ہوئی فصلیں اگائی جانے لگیں، پھر گاؤں آباد ہوئے، خاندان اور قبیلے کا سلسلہ قائم ہوا پھر شہر، ممالک وجود میں آئے۔ قوم اور وطن کے تصورات نے جنم لیا اور انسان خود ساختہ زندان میں بری طرح قید ہو کر اپنے فطرت کے اولین تقاضے کو ہی فراموش کر بیٹھا" [2]

انسانی فطرت کے اس جائزے اور اولین تقاضے کی تسکین اور سفر کی دشواریوں سے بچنے کا ایک طریقہ ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ ہے۔ اس انشائیہ میں ہلکے پھلکے طنز کی چاشنی بھی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر وزیر آغا (ایک مطالعہ) ڈاکٹر انور سدید صفحہ ۹۹

[2] خیال پارے (ریلوے ٹائم ٹیبل) ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۵۸

"در اصل اس علاقے کی اہمیت ان لوگوں کے باعث نہیں جو اگلے زمانوں میں ملکر
ان لوگوں کی وجہ سے ہے جنکی خاک بھی اب لحد میں باقی نہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر
قرن ہا قرن موٹی مٹی نہیں جم چکی ہیں اور جن کی شان میں لوگ آج
اب طول طویل نظمیں لکھ کر زندۂ جاوید ہوجانے کی سعی کرتے ہیں۔ سلہ

انشائیہ ریلوے ٹائم ٹیبل کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر آغا نے اسلوب میں معنی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے

دوسرا زیر بحث انشائیہ "کچھ ملال کی حمایت میں" ہے اس انشائیے میں وزیر آغا نے اسلوب کی جو تکنیک اختیار کی ہے وہ ہے نکتہ آفرینی جس سے انشائیے میں معنویت اور گہرائی آتی ہے۔

اس انشائیہ کا مزاج سادگی لیے ہوئے ہے اس میں کسی قسم کی پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا اور یہی انشائیے کی کامیابی ہے۔ اس میں وزیر آغا نے بخار کی کیفیت کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔

"پھر مجھے یوں لگا جیسے میں قطب شمالی پر کھڑا زمین کو اپنے محور پر گھومتے دیکھ رہا ہوں
ایک لحاف، دو کمبل اور چیختے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی بھی جسم اور روح کی
کپکپاہٹ کو ختم نہ کر سکی اور میں اردو شاعری کے عاشق کی طرح عشق کی پہلی
منزل پر ہی لڑکھڑانے لگا لیکن پھر یکایک جسم کی پہنائیوں سے حرارت کی ایک
تند و تیز لہر اٹھی اور میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے جہنم زار میں گرا ہوا پایا جہاں
شعلے سرخ سرخ زبانیں نکالے افریقہ کے بدوؤں کی طرح چاروں طرف ناچ رہے ہیں
اور پھر جانے حرارت کی لہریں کتنی بار اور کتنی دیر مجھ سے ٹکراتی رہیں۔ سلہ۲

اس انشائیہ کا ایک منفرد پہلو بھی ہے کہ انسان جب بیمار ہوتا ہے تو ایک احساس جو اسے جینے نہیں دیتا وہ ہے دوسروں کے رحم و کرم پر ہونا اور اپنی بے چارگی اور بے بسی کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔

اس انشائیے کے ذریعے وزیر آغا ایک اور حقیقت سے روشناس کرانا چاہتے ہیں اور وہ ہے موت کا خوف اور یہ خوف احساسات میں گہرائی پیدا کرتا ہے۔

یہ انشائیہ طنزیہ ہونے کے ساتھ ساتھ استعاراتی رنگ بھی لیے ہوئے ہے وزیر آغا نے بڑی خوبصورتی سے زندگی اور موت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔

سلہ خیال پارے ڈاکٹر وزیر آغا ریلوے ٹائم ٹیبل صفحہ ۷۲
سلہ۲ " " کچھ ملال کی حمایت میں صفحہ ۵۶

زندگی اور موت کی اس سرحد پر ایک اور احساس بیدار ہوتا ہے۔ یہ شاید ہر کسی
کو حاصل نہ ہوتا ہو لیکن میرے حصے میں ضرور آیا ہے۔ اس احساس کو میں
پوری طرح لفظوں کی گرفت میں لینے سے قاصر ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ
علالت کے دوران میں ایک ایسا نازک مقام بھی آتا ہے جب آپ محسوس
کرتے ہیں کہ اب ایک لمحے میں کائنات کا سربستہ راز آپ پر منکشف ہو جائیگا
بس کوئی شئے ہوتی ہے جو بڑی آہستگی سے بڑھ کر آپ کو دبوچ لیتی ہے[1]

اس انشائیے سے وزیر آغا کا نقطۂ نظر ہمارے سامنے آتا ہے انہوں نے طنز کیا ہے اُن لوگوں پر جو دنیاوی چکروں میں پڑ کر موت کی اٹل حقیقت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں

خلیل الرحمان اعظمی نے خیال پارے کے انشائیوں کو سراہتے ہوئے لکھا ہے

”وزیر آغا کے ان انشائیوں کو جوں جوں پڑھتے جائیے ان جانی بوجھی اور روزانہ
کی دیکھی اور آزمائی ہوئی چیزوں کے بارے میں احساس ہوگا کہ ہم انہیں پہلی
بار دیکھ رہے ہیں اس سے پہلے ہم نے اس زاویے سے کیوں نہ دیکھا
تازگی اور نادرہ کاری کا یہ عنصر ان مضامین کا نمایاں وصف ہے۔ خیال پارے
ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس میں اُنکی انفرادیت نمایاں طور پر ابھر کر
سامنے آئی ہے انشائیہ نگاری کے باب میں اُنکی خدمات کا منکر شاید ہی کوئی ہو“[2]

بارہواں کھلاڑی وزیر آغا کا ایک نمائندہ انشائیہ ہے یہ انشائیہ موضوع کی تصویر کشی کی بہترین مثال ہے وزیر آغا زندگی کی حقیقتوں کو بہت ہی شگفتہ انداز میں ہمارے سامنے پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ ان کے اس انشائیہ کا خلاصہ ہے کرکٹ کا کھیل بارہ آدمیوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن بارہواں کھلاڑی ایک اسٹپنی کی طرح ہوتا ہے یہ کھیل کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے لیکن اس کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع خال خال ہی ملتا ہے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھیل ختم ہو جاتا ہے اور بارہواں کھلاڑی اپنی باری کا انتظار کرتا رہتا ہے اس انتظار کی حالت کے ذریعے وزیر آغا نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش

---

[1] خیال پارے ۔ وزیر آغا ۔ کچھ علالت کی حمایت میں ۔ صفحہ ۵۹
[2] گرد پوش - خیال پارے وزیر آغا

کی ہے کہ بارہواں کھلاڑی ایک ایسا کھلاڑی ہے جس پر ہار اور جیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ گو کہ وہ ٹیم میں شامل ہونے کے باوجود وہ ٹیم کی تمام ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہے۔ وزیر آغا نے بارہواں کھلاڑی کی اہمیت کو اس لئے تسلیم کیا ہے کہ وہ دنیاوی جنجال سے اپنے کو الگ رکھتا ہے کسی مسئلے کو زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بناتا۔ عملی زندگی میں بھی وہ اسی نظریے کو اہم بتاتے ہیں۔

وزیر آغا نے ان الفاظ میں بارہواں کھلاڑی کی خصوصیت بیان کی ہے۔

"بارہواں کھلاڑی کی آزادہ روی" اور تماشائی دونوں پابندیوں کو جھٹک کر اس عظیم تر آزادہ روی میں تبدیل ہونے کا دوسرا نام ہے جس میں تماشائی کی حیثیت تبدیل ہو جاتی ہے یوں آزادہ روی کے مسلک میں کشادگی در آتی ہے اور اس کے متعدد پہلو نظر کے سامنے ابھر آتے ہیں تاہم آزادہ روی کا بنیادی مسلک اپنی جگہ قائم رہتا ہے" [1]

ڈاکٹر انور سدید نے اس انشائیہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"یہ انشائیہ فرد کو ذات کے مدار سے نکال کر پہلے معاشرے کے مدار میں داخل کرتا ہے اور یوں ان دیکھے طور پر اسے کائنات کے وسیع تر مدار کے معنی سمجھانے لگتا ہے اور یوں زندگی کی ادھ کھلی حقیقتوں کو شگفتہ انداز میں کچھ اس طرح آشکار کرتا ہے کہ قاری اس انوکھے انکشاف پر قاری ایک نئی دنیا کی سیر کرنے لگتا ہے" [2]

ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید جو رائیں اس انشائیہ کے بارے میں دی ہیں ان سے لگتا ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے سے انحراف نہیں کیا بلکہ ایک ہی نتیجہ اخذ کیا ہے اور وہ ہے زندگی کی ادھ کھلی حقیقتوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش۔

حقہ پینا وزیر آغا کا ایک اہم انشائیہ ہے۔ حقہ پینے کے عمل کے ذریعے وزیر آغا نے پرانی انسانی قدروں اور تہذیبی اور سماجی روایتوں کی اہمیت اور معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وزیر آغا نے حقہ کا موازنہ موجودہ دور کے فیشن سگریٹ نوشی سے کیا ہے۔ وزیر آغا کی نظر میں حقہ کی محفل لوگوں میں ربط اور محبت پیدا کرتی ہے ایک دوسرے کے دکھ درد

---

[1] سمندر اگر میرے اندر ڈاکٹر وزیر آغا پیش لفظ صفحہ ۲۲

[2] ڈاکٹر وزیر آغا (ایک مطالعہ) ڈاکٹر انور سدید صفحہ ۹۷-۹۹

کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ تنہائی کی اذیت سے نجات دلانے کے سبب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ذریعے نفرتیں اور مغائرت ختم ہو جاتی ہے نسلی اور خاندانی تعصبات کی جگہ انسانی بھائی چارہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے وزیر آغا نے حقہ پینے کو اجتماعیت کی علامت بتایا ہے۔ وزیر آغا کا خیال ہے اس کے برعکس سگریٹ نوشی ایک انفرادی عمل ہوتی ہے اس لیے انسان کے اندر احساس برتری پیدا کرتی ہے۔

اس انشائیہ میں وزیر آغا نے اپنی بات طنزیہ انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ حقہ نوشی سے وابستہ کاہلی، کام چوری، بے کاری اور گپ بازی کی عادتیں ہمارے لیے نقصان دہ ہیں دوسری طرف حقہ نوشی کے مقابلے میں کھانے کے عمل کو ایک جارحانہ عمل بتا کر ایک عجیب صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس میں اسلوب کا لطف بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً

"جب آپ حقے کی نے کو منہ میں لیکر سانس کو اندر کی طرف کھینچتے ہیں تو فقط چلم کی بھر دھواں ہی اندر جاتا ہے جیسے آپ دوسرے ہی لمحے منہ اور نتھنوں کے ذریعے خارج کر دیتے ہیں اس لیے یہ صرف عمل ذہنی کرب کا نہیں بلکہ روحانی طمانیت کا ذریعہ ہے جو کھانا کھانے یا نوالہ چھینے کے عمل میں ناپید ہے۔"[1]

اس اقتباس میں چلم کی بھر دھواں۔ یہ صرف عمل اور روحانی طمانیت کا جو ذکر ہے اور کھانا کھانے کے پورے عمل کو جس طرح اس سے خالی بتایا گیا ہے وہ طنز کی خوبصورت مثال ہے۔ کھانا کھانے کی منظر کشی بھی بہت اہم ہے۔

"پہلے آپ روٹی کو پرزے پرزے کرتے ہیں اور گوشت کو بوٹی بوٹی اور اس کے بعد ان کو باہم ملا کر اپنے ناخنوں کی مدد سے منہ میں ٹھونستے ہیں۔ جہاں خونخوار تیز بھالو آپ کے اصلی یا مصنوعی دانت ان پر بھوکے گدھوں کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں اور کاٹنے بھنبھوڑنے اور پیسنے کے وحشتناک عمل کا آغاز ہو جاتا ہے۔"[2]

اس اقتباس میں جس طرح کے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے وہ تہذیب کے برعکس صورت حال پیدا کرنے میں خاص طور سے معاون ہوتے ہیں۔ اس تضاد کو ابھار کر وزیر آغا نے بڑی کامیابی سے حقہ پینے کو ایک تہذیبی عمل قرار دیا ہے اس نقطہ نظر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ حقہ کی تیاری کے عمل کو جس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے وہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کہ آج کی عملی زندگی میں یہ اہتمام ممکن نہیں۔ یہ صرف ایسے دور میں ممکن ہوتا ہے جسے تہذیبی چھوڑتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں وزیر آغا نے بجا طور پر سگریٹ کو اس اہتمام کے نہ ہونے کے سبب

---

[1] دوسرا کنارا۔ ڈاکٹر وزیر آغا "حقہ پینا" صفحہ ۲۷

[2] " " " " ۲۷-۲۸

بجرا اہم قرار دیتا ہے۔ آج کے مصروف انسان کے لئے کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی کام کے لئے اتنا اہتمام کرے۔
ڈاکٹر آغا نے حقہ نوشی کا مقابلہ بہت خوبصورتی کے ساتھ موسیقار کے موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے عمل سے بھی کیا ہے۔

"جس طرح ایک موسیقار پہلے اپنے ساز کی لے اور آہنگ کو درست کرتا ہے اور پھر کوئی نغمہ
چھیڑتا ہے بالکل اسی طرح ایک فنکار حقہ نوش حقے سے پانی خارج کرنے کے عمل میں حقے
کی گڑگڑاہٹ کو ایک خاص صوتی مقام پر لا کر گویا قائم کر دیتا ہے"[1]

پورے انشائیے میں جو نقش سب سے اہم ابھرا نظر آتا ہے وہ مصنف کا نقطہ نظر ہے جیسے یہ واقعہ کہ جب ایک شخص
منہ دوڑتی ہوئی کار کو رکوا کر اور انتہائی اہم سیاسی بحث کو بیچ میں چھوڑ کر کسی بھی چیز کا لحاظ لئے بغیر ایک کھیت کی
منڈیر پر حقہ پیتے چند لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے یہاں یہ احساس بہت اہمیت رکھتا ہے۔

"میں نے سوچا جو شخص حقے کی طلب پوری کرنے کے لئے ایک دھواں اگلتی محفل اور تیز رفتار
گاڑی کو روک سکتا ہے وہ زندگی کے معاملات میں کسی قرار پذیر سنجیدگی کا اظہار
بھلا کیوں کرنے لگا"[2]

یہاں سنجیدگی کے ساتھ قرار پذیر کی صفت کا استعمال پڑھنے والوں کو شبہ میں ڈال دیتا ہے کہ وزیر آغا نے
اس بات کو کسی اور طریقے سے ادا کیوں نہیں کیا۔ مثلاً وہ اس طرح کہہ سکتے تھے کہ اس پر کسی سنجیدہ گفتگو کا کیا
جانا بے کار ہے یا اس معاملے پر سنجیدہ گفتگو کا کوئی فائدہ نہیں یا اس انداز سے سنجیدہ گفتگو کرنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے
وغیرہ وغیرہ لیکن اس طرح اول تو طنز میں وہ کاٹ پیدا نہیں ہوتی جو اس میں ہے دوسرے یہ کہ انشائیہ کے ڈھانچے کا وہ بنیادی اصول
فراموش ہو جاتا اور اسلوب میں وہ لطافت پیدا نہ ہو پاتی جو وزیر آغا پیدا کر پاتے ہیں۔ اس
انشائیہ میں وزیر آغا نے مزاحیہ صورت حال تو ضرور پیدا کی ہے لیکن ان کی گرفت اتنی سخت ہے کہ تضحیک کے
رنگ کو حاوی ہونے نہیں دیتی۔

وزیر آغا حقیقتوں کی ہلکی سی شگفتگی بھی دکھاتے ہیں جس سے ہلکا سا تبسم ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہی خوبی
دراصل اسلوب کی تازگی کا نمونہ ہے۔

وزیر آغا کے انشائیوں میں دیہاتی پس منظر کا ایک خاص مقام ہے۔ دیہات ایک ایسی دنیا ہے جہاں
انسان کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف شہر میں انسان ہمیشہ تنہا ہوتا ہے۔ وزیر آغا اپنے انشائیوں میں دیہاتی

---

[1] دوسرا کنارا ڈاکٹر وزیر آغا "حقہ پینا" صفحہ ۳۵
[2] " " " " ۳۶

زندگی کو اس طرح ہیبت کرتے ہیں کہ وہ خود اس کا ایک حصہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کی عمدہ مثال ان کا انشائیہ "لاہور" ہے
اس انشائیے میں وزیر آغا نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بڑے شہروں میں زندگی کی تمام آسائشوں اور آسودگیوں کے
باوجود انسان سکون اور فرصت سے محروم ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ دیہات میں رہتے ہیں وہ فطرت کے حسن
سے محظوظ ہوتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں لیکن شہر میں رہنے والے ان
نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر والوں میں خلوص، ہمدردی اور دوسری انسانی خصوصیات کی کمی محسوس ہوتی
ہے اس لیے شہر میں رہنے والا ہر شخص تنہائی اور عدیم الفرصتی کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی حال لاہور کا بھی ہے
لاہور کے رہنے والوں کے جذبات اتنے سرد ہو گئے ہیں کہ وہ دوسروں کی تکلیف اور مصیبت میں مددگار ہونے کے بجائے
صرف تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔

> "آج سے کئی سو برس پہلے کسی ظالم حملہ آور نے لاہور کے باہر شاید شو بارک کے علاقے میں قتل
> عام کا تماشا دکھایا اور اندرون لاہور سے ایک صاحب اپنے دونوں صاحبزادوں کو زرق برق لباس
> مہیا کر اور انگلیوں سے لگا کر خراماں خراماں لاہور کے کسی قدیم دروازے سے باہر کی طرف آئے
> دروازے کے باہر ان کی ملاقات اپنے کسی دیرینہ کرم فرما سے ہوئی انہوں نے حال احوال
> دریافت کیا۔ پھر گھبرا کر کہا "بھائی اس ہنگامہ دار و گیر میں ان بچوں کو کہاں لیے جا رہے ہو"
> یار انہیں کتلام (قتل عام) کا میلہ دکھانے جا رہا ہوں" [1]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانیت کس طرح دم توڑ رہی ہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ لوگ دوسروں کی
بے بسی اور مصیبت سے لطف اندوز ہونے لگے ہیں اور اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔
ان باتوں کے علاوہ دوسری چیز جو خاص طور سے نمایاں نظر آتی ہے وہ آکاس بیل اور پیر تسمہ پا کے
استعارے ہیں جن کی وضاحت وزیر آغا نے یوں کی ہے

> "پیر تسمہ پا تو ایک بوجھ ہے جسے گردن پر لاد دیا جاتا ہے اور پھر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے
> سوتے جاگتے یہ بوجھ انسان کو زمین بوس ہونے پر مجبور کیے رکھتا ہے دوسری طرف
> آکاس بیل کی طرف دیکھیے پیلی سرسوں ایسی یہ مخلوق سارے درخت پر یوں پھیل
> جاتی ہے کہ اس کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ آکاس بیل کی جڑ زمین میں نہیں ہوتی

---

[1] دوسرا کنارہ - ڈاکٹر وزیر آغا "لاہور" صفحہ ۹۶

بلکہ اس کی تو جڑ ہوتی ہی نہیں وہ اپنی بقا کے لئے درخت کے پورے وجود سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ درخت کا رس کشید کرتی رہتی ہے اس کی زندگی کا تمام تر دارومدار درخت کی زندگی پر ہے درخت کو کاٹ دیجئے تو آکاس بیل بھی مر جائے گی۔" [1]

یہاں شپنگلر کی یہ مثال اہم ہے کہ شہر تو ایک درخت کی طرح ہوتا ہے جس کی جڑیں زمین میں اتری ہوئی ہوتی ہیں۔ پرانے شہروں کی طرح "لاہور" بھی ہے۔ ان کی تہذیبی اور تاریخی جڑیں اتنی دور تک ہوتی ہیں کہ انہیں اکھاڑ پانا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لئے آکاس بیل کے استعاراتی پیکر کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں فن کار کا خیال ہے کہ اس کی جڑیں نہیں ہوتیں۔ جس سے بات میں بات نکلتی ہے لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لاہور اب وہ لاہور نہیں رہا جسے تہذیب کے ایک مرکز کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ پیر تسمہ پا کے استعاراتی پیکر میں جو قدامت اور اپنی جگہ جمے رہنے کا تصور اور تبدیلیاں قبول نہ کرنے کا جو عمل ملتا ہے وہ بھی نمایاں ہے —
وزیر آغا کا یہ انشائیہ بھی معروف رہا ہے۔ لیکن اگر پطرس کے انشائیہ "لاہور کا جغرافیہ" سے اس کا تقابلی مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ پطرس کا انشائیہ قاری کو جس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے ذہن پر جو نقوش چھوڑتا ہے۔ وزیر آغا کے انشائیہ "لاہور" کو اگر فنی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پطرس کا انشائیہ زیادہ بے تکلف، برمحل اور اثر انگیز ہے جبکہ وزیر آغا کا یہ انشائیہ کس قدر تصنع پر مبنی ہے —

وزیر آغا کے انشائیوں میں جو خاص بات دیکھنے کو ملتی ہے وہ اپنے وطن کی مٹی سے پیار ہے۔ انہوں نے اس کیفیت کو طرح طرح سے اپنے انشائیوں کا موضوع بنایا ہے زیر نظر انشائیہ "بسنت" بھی اسی کوشش کا نام ہے۔ ظاہری طور پر بسنت ایک موسم کا نام ہے لیکن اس میں اور دوسرے موسموں میں بڑا واضح فرق ہے۔ بسنت کی اہم خصوصیت وصل یا آمیزش ہے بسنت میں سردی اور گرمی دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس لئے وزیر آغا نے سردی اور گرمی کی اس کیفیت کو سنجوگ کا نام دیا ہے بسنت کا موسم اپنے آپکو سردی اور گرمی کے تابع نہیں کرتا بلکہ اپنی انفرادیت اور شناخت کو برقرار رکھتا ہے۔

یہ انشائیہ وزیر آغا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتا ہے اور جب قاری اس حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے کہ اس کی شخصیت ہی فطرت کا عکس ہے تو ان انشائیوں میں وہی پہلو قاری کو اپنی طرف زیادہ

---

[1] دوسرا کنارہ۔ ڈاکٹر وزیر آغا "لاہور" صفحہ ۵۴

متوجہ کرتا ہے جنکا براہ راست وزیر آغا کی شخصیت سے گہرا تعلق ہے۔

اس موسم میں وزیر آغا نے پتنگیں اڑائے جانے کی مناسبت سے تتلیوں کی اڑان کا ذکر بہت خوب کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پتنگ تتلیاں اور سرسوں کے پھول سب ایک دوسرے کا حصہ ہوں اور کسی کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھا جا سکتا ہو۔ تتلیاں، پتنگیں اور سرسوں کے پھول رنگینی، تازگی اور قوت پرواز کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہیں اور یہ قوت حیات روحانیت سے کسب فیض کرتی ہے۔ وزیر آغا نے تتلی اور پتنگ کی بلند پروازی کے ذریعے ــــ اشارہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ وزیر آغا نے بسنت کے حوالے سے زرد رنگ کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے مثلاً

" البتہ خزاں کا رنگ ایک ہے یعنی پیلا رنگ ایسی رنگ بسنت کا بھی ہے مگر دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے خزاں کی پیلاہٹ لاش کی زردی سے مشابہ ہے جبکہ بسنت کی پیلاہٹ میں زندگی کا پھوٹ موجزن ہے دوسرا فرق یہ ہے کہ خزاں کی پیلاہٹ گرتے ہوئے پتوں کی زردی سے مرتب ہوتی ہے جبکہ بسنت کی پیلاہٹ کھلتے ہوئے پھولوں سے پیدا ہوتی ہے۔ بسنت اور سرسوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے مسرت کی یلغار کے سامنے پھول کھیت ہو جاتے ہیں مگر سرسوں پھولتی چلی جاتی ہے بس یہی کھلتا، لہراتا ہوا سرسوں کا رنگ بسنت کا اصل رنگ ہے " [1]

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انور سدید نے اس انشائیے کو سراہتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے

" وزیر آغا نے انشائیہ میں مظاہر کے مخفی معنی اجاگر کئے ہیں۔ اس عمل انکشاف میں ان کے اسلوب نے ان کی سب سے زیادہ معاونت کی ہے۔ چنانچہ انکے انشائیے میں تازہ کاری بھی ہے اور ندرت بھی " [2]

اپنے انشائیے "سیاح" میں وزیر آغا نے مسافر اور سیاح کے بنیادی فرق کو واضح کیا ہے۔ سیاح اپنی مرضی و خوشی سے سفر کرتا ہے نہ کہ کسی دباؤ کی وجہ سے۔ وہ اپنے وطن اور پیشے کی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہوتا ہے اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی جو اس کو کسی خاص سمت میں چلنے کے لیئے مجبور کرے۔ سیاح چلتا جاتا ہے اور منزلیں خود بخود آسان ہوتی جاتی ہیں اگر سیاح کو باطنی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف

---

[1] دوسرا کنارہ ڈاکٹر وزیر آغا "بسنت" صفحہ ۵۸

[2] ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ۔ ڈاکٹر انور سدید صفحہ ۱۰۶

مسافر کو بادل ناخواستہ اس مصیبت میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ دوران سفر میں بھی گھر اور سماج کے تمام رشتوں کو قائم رکھنا پڑتا ہے۔ ان زنجیروں سے مسافر فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ مسافر کی مجبوری کو وزیر آغا نے استعارہ کی مدد سے بتلانے کی کوشش کی ہے

"مسافر کی حالت تو اس پتنگے کی سی ہے جو مکڑی کے جالے میں قید ہے اور جالے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور ایک منزل سے دوسری منزل تک جالے کی ڈور سے بندھا ہوا پڑا چلا جائے لیکن سیاح مکڑی کے جالے سے یکسر آزاد ہے۔ گھر کی دیواریں اور منزل کے دھاگوں سے بھی اسے کوئی سروکار نہیں" لہ

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر آغا نے انشائیہ کے بنیادی مزاج کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے وزیر آغا سیاح کی آزادہ روی دراصل معاشرتی پابندیوں کی سنگلاخی فضا سے باہر آنے میں بتاتی ہے۔

"چوری سے یاری تک" کے عنوان سے معنون انشائیہ دوسرے انشائیوں کے مقابلے میں موضوع اور مزاج کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اس انشائیہ میں وزیر آغا نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک شکست خوردہ قوم فاتح قوم کی تہذیب، ثقافت اور علمیت سے متاثر ہوتی ہے لیکن وزیر آغا نے اس حقیقت سے انحراف کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ آریا جب ہندوستان میں ایک فاتح قوم کی حیثیت سے داخل ہوئے تو ہندوستانی آریوں سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ شکست خوردہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی ہندوستانی تہذیب، مذہب اور عقل و حکمت سے آریوں کو متاثر کیا اور اپنی اہمیت کو آریوں سے تسلیم کروایا۔ جب آریوں نے ہندوستانی قلعوں کو بری طرح برباد کیا تو بدلے میں ہندوستانیوں نے آریوں کے جانور، سواریاں وغیرہ چرانی شروع کر دیں۔ دوسری طرف چونکہ آریا عیش و عشرت کی زندگی سے ناواقف تھے ان کو اس طرف متوجہ کرایا اور رفتہ رفتہ شراب، جوئے اور ناچ گانے کا عادی بنا دیا اور اس طرح ہندوستانیوں نے آریوں کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اس طرح آریہ جیتی ہوئی بازی ہار گئے اور آریہ فاتح ہونے کے باوجود ہندوستانی تہذیب سے مات کھا گئے۔

دراصل شکست اور فتح صرف جنگی نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت تہذیبی ہوتی ہے سارے معاملات بالآخر تہذیبی معاملات میں آ کر جذب ہو جاتے ہیں۔ فاتح قوم کا حملہ بھی دراصل تہذیب کے حملہ کا دوسرا نام ہے

لہ چوری سے یاری تک۔ ڈاکٹر وزیر آغا "سیاح" صفحہ ۲۳

اس افسانہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس افسانہ کو بنیادی طور پر ایک طنزیہ اور استعاراتی افسانہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ وزیر آغا نے جن مخصوص عقیدوں کا ذکر کیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے استعاراتی ہیں خاص طور سے کوے کو جس طرح کاگا سے بدل کر وزیر آغا نے اس کا فائدہ اٹھایا ہے وہ بھی واضح قوم کی نمائندگی کرتا ہے۔

"دیوار" نام کا افسانہ بنیادی طور پر طنزیہ اور استعاراتی ہے۔ اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح انسان انسانیت کا دشمن ہو گیا ہے۔ یہ دیواریں کہیں مذہب کا رنگ لیئے ہوئے ہیں تو کہیں رنگ کا اور کہیں خیال اور نظریے کا۔ "دیوار" بنیادی طور پر تقسیم اور تفریق کا استعارہ ہے ایک ایسا استعارہ جس سے ذاتی ملکیت کا تصور پیدا ہوتا ہے یہی تصور سارے خون خرابے کی بنیاد ہے۔ وزیر آغا نے اس کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے مثلاً

"چنانچہ اس نے کھینچ لا کر زمین کو لاتعداد چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا اور
ہر ٹکڑے کے گرداگرد ایک حصار سا کھینچ دیا یہ دوسری دیوار تھی۔ دیوار جو اس بار آدم
اور حوا کی بجائے آدم اور آدم کے درمیان آن کھڑی ہوئی اور جیسے آدم نے پیار
کرنے کی کوشش کی تو اس کی خوبصورت انگلیاں خون گرم سے آلودہ ہو گئیں"[۱]

اس افسانے میں جہاں ایک طرف ملکیت کا تصور پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف کائنات میں جاری خون خرابے کی طرف بھی اشارہ ہے اس کے ساتھ ساتھ اکبر کے اس شعر کی طرف وزیر آغا نے بہت واضح اشارہ کیا ہے

مناہیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

وزیر آغا کی خوبی یہ ہے کہ پورے افسانہ میں انہوں نے خون خرابے یا موت کا واضح ذکر نہیں کیا ہے اس استعاراتی پیکر کی خوبصورتی اور دلآویزی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انگلیوں کی خوبصورتی کے ساتھ خون گرم سے جس آلودگی کا ذکر کیا ہے اس سے زندگی سے وزیر آغا کی بے پناہ محبت اور لگاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو خوبصورت حیات کی نمائندگی کرتا ہے "دیوار" کی دوسری استعاراتی شکل کو وزیر آغا نے دو جنسوں کے درمیان تفریق، رنگ اور نسل، شر اور سماج کا دوسرا بنیادی سبب بتایا ہے

۱۔ جنوری سے مارچ تک ۔ وزیر آغا "دیوار" صفحہ ۷۸ کالم ۲ علم

وزیر آغا نے اسے بھی بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے اسلوب، بیان کی دلکشی، تازگی اور شگفتگی کو تو برقرار رکھا ہی ہے ساتھ ہی اس میں افسانوی عنصر بھی شامل کرنے کی کوشش کی ہے جس سے لطف دوبالا ہو گیا ہے

"سمندر کے کنارے کسی کنگرے درخت کا سہارا لیئے اور سیب کا ٹکڑا چباتے ہوئے آدم کی نظریں بے خیالی میں حوا کی جانب اٹھتی ہیں جو ایک نازک سی شاخ کی طرح اپنے ہی بار سے جھکی ہوئی سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے کو اٹھانے کی کوشش میں ہے اور آدم کا سرد دل یکبارگی زور سے دھڑک اٹھتا ہے اس کی عجیب کیفیت جان آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے ہونٹ لرزنے لگتے ہیں سانس میں ناہمواری آ جاتی ہے اور زبان پر ہزاروں لاکھوں ان کہے الفاظ کے رنگین لبادے زیب تن کئے تحرک اٹھتی ہیں۔ آدم حوا پہلی بار نظر میں آدم کی اس نگاہ کرم کو بھانپ لیتی ہے اور اس کی آنکھیں محجوب سی ہو کر جھک جاتی ہیں۔ ہونٹوں پر تبسم نمودار ہو جاتا ہے اور وہ شرمائی ادا کے ساتھ انجیر کے بڑے بڑے پتوں سے اپنے جسم کو چھپا لیتی ہے" ؎

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں آدم کو جو جنت سے نکالنے کی روایت ہے اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے یہی وزیر آغا کا فنکارانہ انداز ہے جسے ہم ان کا منفرد انداز کہہ سکتے ہیں۔

وزیر آغا کا انشائیہ "معصوم لوگ" ایک طنزیہ انشائیہ ہے اس انشائیے میں وزیر آغا نے انسان کے ترقی اور تقسیم کے مصنوعی عمل کی مخالفت کی ہے۔ فطرت نے حسن، معصومیت اور پاکیزگی کو نام کی قید سے آزاد رکھا ہے کیونکہ حسن تو صرف حسن ہوتا ہے اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اس کو توڑنا اسے ناکارہ بنانا اس کو نام دینا بد مذاقی کی دلیل ہے جس کے ہم اکثر مرتکب ہوتے رہتے ہیں وزیر آغا انسان کے اس کارنامے کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں

"میٹھی اور رسیلی آواز والی سفید رنگ چڑیا کو کوئل، سرخ زرد اور سفید چاندی کے ورق ایسے پھولوں کو بار چولا، اور گھنگھریالے بالوں، سیب کی طرح سرخ گالوں اور شیشے کی طرح شفاف آنکھوں والے بچے کو جان احمد کا نام دے کر بد مذاقی، تصنع اور فریب کی منہ بولتی تصویر بن جاتا ہے اور پھر فخر کرتا ہے کہ اس نے بڑی روح کو

؎ چوری سے یاری تک۔ وزیر آغا "دیوار" صفحہ ۸۵

موت سے قبل ممبروں اور ناموں کے کتبوں اور قبروں میں مقید کر لیا ہے کیسی عجیب بات ہے؟ [1]

یہ انشائیہ بڑی معصومیت کے ساتھ ان لوگوں پر طنز کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جو گوبھی کے پھول کو توڑنے یا اسے نام دے کر محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ انشائیہ قوت حیات کی علمبرداری بھی کرتا ہے کہ حیات ہر رنگ میں جلوہ افروز ہوتی ہے بقول غالب

"ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے"

یہی وزیر آغا کا بھی رویہ ہے اور یہی رویہ انسان کی آزاد فطرت میں ودیعت بھی کی گئی ہے مگر افسوس کہ انسان اپنے اصولوں ضابطوں میں ہر چیز کو قید کر کے رفتہ رفتہ خود اصولوں کا ہی غلام ہو جاتا ہے۔

وزیر آغا کا انشائیہ "دستر خوان" وزیر آغا کے تازہ ترین مجموعے "سمندر اگر میرے اندر گرے" [2] میں شامل ہے۔ اس مجموعے میں وزیر آغا کے نظریات انشائیے کے سلسلے میں بہت نمایاں اور روشن ہیں اس انشائیے میں وزیر آغا نے آج کی موڈرن سوسائٹی پر بھی طنز کیا ہے کیونکہ جدید معاشرت اور جدید تہذیب سے ہر شخص اتنا مرعوب ہے کہ اس نے جدید معاشرت کی بہت سی باتیں بغیر سوچے سمجھے اختیار کر لی ہیں۔ اسے اس موڈرن سوسائٹی نے اتنا متاثر کیا ہے کہ وہ اس کی ظاہری چمک دمک کے دھوکے میں آجاتا ہے اور اپنی تہذیب و معاشرت سے بیگانہ ہونے میں اسے دیر نہیں لگتی۔ مثال کے طور پر لوگ زمین پر دستر خوان لگا کر کھانا کھانا بہت معیوب سمجھتے ہیں۔ آج کی ایڈوانس سوسائٹی کے دلدادہ میز و کرسی سے بے نیاز ہو کر ٹہل ٹہل کر کھانا کھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں وزیر آغا نے موجودہ دور کے طریقوں کو ناپسند کیا ہے وہ کہتے ہیں

"اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیا ہماری تہذیب کا گراف نیچے سے اوپر کی طرف گیا ہے تو میں لوگوں کا کہ بے شک ایسا ہرگز نہیں ہوا کیونکہ ہم نے فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھنے کی روایت کو ترک کر کے کھڑے ہو کر اور چل پھر کر کھانا کھانے کے طریقے کو اپنا لیا ہے جو چرنے اور دانہ دنکا چگنے ہی کا جدید روپ ہے۔" [2]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر آغا نے جدید تہذیب کی سخت مخالفت کی اور ہماری تہذیب کو تنزل کی طرف گامزن بتایا وہ کھڑے ہو کر کھانا کھانے کو ایک نیم وحشی عمل بتاتے ہیں کیونکہ اس سے خود غرضی اور نفسا نفسی جنم

---

[1] چوری سے یاری تک۔ وزیر آغا "یہ معصوم لوگ" صفحہ ۸۷

[2] سمندر اگر میرے اندر گرے " دستر خوان صفحہ ۷۶-۷۵

لیتی ہے۔ اس کے برخلاف دسترخوان پر مل جل کر کھانا کھانے سے انسانی محبت اور ایک دوسرے کے خیال کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اس انشائیہ میں وزیر آغا نے طرح طرح سے قدیم طرزِ معاشرت کی اہمیت پر زور دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ پرانی قدریں ہی ہمارا سرمایہ ہیں اور آنے والے وقتوں میں یہی پرانی قدریں ہماری پہچان کا سبب بنیں گی اس انشائیہ میں وزیر آغا نے تازگی اور شگفتگی کو برقرار رکھتے ہوئے بھی نصیحتوں کے رنگ کو حاوی ہونے نہیں دیا ہے۔ دسترخوان پر کھانا کھانے اور لوٹنے کے فرق کو بہت خوبصورت طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے ــــ

"سچی بات تو یہ ہے کہ دسترخوان پر پوری دل جمعی سے بیٹھ کر کھانا کھانے اور لوٹنے کی صورت میں انتہائی سراسیمگی کے عالم میں کھانا زہر مار کرنے میں وہی فرق ہے جو حرت اور ہوس میں ہے خوشبو اور بو میں ہے صبح کی جبل قدمی اور سڑک کی دوڑ میں ہے" سلہ

اس اقتباس سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے کہ وزیر آغا نے قدیم طرزِ معاشرت اور ہندوستانی تہذیب کے طور طریقوں کی افادیت اور اہمیت ظاہر کی ہے اور نئی تہذیب کے نقائص کا پردہ چاک کیا ہے۔

وزیر آغا کا ایک اور انشائیہ "پل" ہے اس انشائیہ میں وزیر آغا نے وصل اور فصل دو ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے گرد شاید دنیا کی پوری تاریخ گھومتی ہے۔ دنیا میں تباہی لانے والی قوتیں جہاں ایک طرف کائنات کی تمام چیزوں میں فاصلے پیدا کر جاتی ہیں وہیں دوسری طرف تعمیر کرنے والی قوتیں وصل پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں پل درحقیقت اسی فصل کو وصل میں بدلنے کا ذریعہ ہے جسکو وزیر آغا نے اپنے انشائیے میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ان کی یہ بات بہت اہم ہے کہ

"پل اگر انسان اور انسان کے درمیان ہو تو عالمی رواداری اور بھائی چارہ کو جنم دیتا ہے۔ بندے اور خدا کے درمیان ہو تو روح کی غذا کا اہتمام کرتا ہے لیکن اگر انسان اور حیوان کے درمیان ہو تو دونوں کی ذاتی اور نسلی دشمنی لحظہ بھر کے لئے ختم ہو جاتی ہے اور وہ تالاب کے گدلے پانی میں اشنان کر کے ایک جیسی مخلوق بن جاتے ہیں بھینسے اور بندے کا فرق معدوم ہو جاتا ہے"۔ سلہ

اس اقتباس میں جہاں ایک طرف وزیر آغا گدلے اور گندے پانی سے غسل کرنے والوں پر طنز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں انہوں نے قوموں کے خاتمے کی طرف بھی واضح اشارہ کیا ہے جو مختلف طبقوں کے درمیان قائم ہو کر تباہی اور بربادی کا سبب بنتے ہیں

سلہ سمندر اگر میرے اندر گرے - وزیر آغا دسترخوان صفحہ ۴۵

سلہ " " پل " ۶۷

وزیر آغا نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ دراصل کا یہ خاتمہ جسے انہوں نے پل کے اٹھنے سے تعبیر کیا ہے کیا کیا تباہیاں لاتا ہے۔ اس بات کو وزیر آغا نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"جب پل اٹھتا ہے تو نفرت عزل بیابان کی طرح جاگ اٹھتی ہے۔ انتقام سینے کے اندر کروٹیں لینے لگتا ہے۔ اندر کی ساری خباثت جو قاشوں اور ٹکڑوں میں بٹ کر پل پر سے بآسانی گزر جایا کرتی تھی پل کے تباہ ہو جانے کے باعث دریا کے کنارے پر ہی ڈھیر ہونے لگتی ہے تا آنکہ ایک بھوت سا بن جاتی ہے اور بالکل اسی طرح کا بھوت دوسرے کنارے پر بھی اُگ آتا ہے تب یہ دونوں بھوت اپنے ہیولوں کی صورت ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہمہ وقت مغلظات نشر کرنے لگتے ہیں پھر کسی اور حسب بھر کر دوسرے کنارے پر آجاتے ہیں اور سارا عالم "نقض لوڑ" ہو جاتا ہے" [1]

لیکن اس کے برعکس جب پل تعمیر ہوتے ہیں تو جو خوشگوار صورت حال پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے کیا جاتا ہے

"لیکن ایک دریا کا طویل و عریض پاٹ محض ایک سیرگاہ میں تبدیل ہو جاتا ہے چھوٹے چھوٹے خوبصورت بالک ہاتھوں میں پھول اور ہار لیے پل پر کھڑے ہو جانے لگتے ہیں ننھے بیاہتا جوڑے اپنے اندر کے "نیاگرا آبشار" کو باہر سے دیکھنے کے لیے پل پر آ کھڑے ہوتے ہیں جیتی کے رنگین اور گوار لوجوان سے اور جیتی بھی ہاتھوں میں ہاتھ دیئے پل پر سے بخیر و خوبی گزر جاتے ہیں" [2]

یہاں وزیر آغا نے ماضی سیاست کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قوت حیات کی طاقتوں کی بھی نشاندہی کی ہے ریگن اور گورباچوف جو امریکہ اور سابق سوویت یونین کے صدر تھے یہ دونوں بڑی طاقتیں دنیا کے چین اور سکون کو تباہ و برباد کرنے والی طاقتوں کی علمبرداری کرتے ہیں ظاہر ہے ان دونوں کی دوستی اس عالم کے لیے ایک بہت بڑے واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جو اس انشائیہ کا موضوع ہے۔ اس انشائیے میں وزیر آغا نے انسان اور خدا کے باہمی ربط و تعلق کے استحکام پر بھی زور دیا ہے وہ اس انشائیے کی مدد سے آپسی دوری اور نفرت کے ازالہ کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں

١؎ سمندر اگر میرے اندر گرے وزیر آغا (پل) صفحہ ٤٤

٢؎ " " " ٤٤

"کھلونے" میں وزیر آغا نے کائنات کو کھلونے کے استعارے کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے میں کھلونے میں پوشیدہ دلچسپی کے عنصر کو خاص طور سے اہمیت دی گئی ہے اس بات سے وہ منفی عنصر بھی سامنے آتا ہے جسے غالب نے رنگ لالہ و گل و نسرین کی جدائی کے ذریعے پیش کیا تھا بلکہ غالب ہی کے یہاں کائنات کے لیے کھلونے کا استعارہ بھی استعمال ہوا ہے لیکن غالب نے اس میں موجود دلچسپی کے عنصر سے زیادہ اس کی بے حیثیتی کو اجاگر کیا ہے یعنی دنیا کی حیثیت میرے نزدیک بچوں کے کھلونے جیسی ہے جو آج خریدا اور کل ٹوٹ جاتا ہے کھلونے کی بے ثباتی کے ذریعے غالب نے کائنات کی بے ثباتی کو پیش کیا ہے وزیر آغا نے پہلے ہی جملے سے یہ بات صاف کر دی کہ "میرے لیے اس جہان خضر کا ہر سال ایک کھلونے کی طرح ہے جس کے ساتھ میں پورے تین سو پینسٹھ دن کھیلتا ہوں" لیکن وزیر آغا اسی جگہ اپنی بات ختم نہیں کرتے اور بلکہ چل کر ہر سال کو نیا کھلونے سے تعبیر کر کے لکھتے ہیں کہ "پھر جب میرے ہاتھ میں نئے سال کا ایک نیا نکور کھلونا تھما دیا جاتا ہے تو میں پرانے کھلونے کو پرے پھینک دیتا ہوں اور کبھی کیا واقعی؟" [1]

یہ سوالیہ نشان اگلے حصے کے لیے بنیاد ثابت ہوتا ہے وزیر آغا لکھتے ہیں

"ہر کھلونا دراصل ایک خواب ہے اور خواب سے دست بردار ہونا کسی ذی روح کو بھی پسند نہیں" [2]

آخر میں اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر آغا تلمیح کر رہے ہیں کہ آج کل کا انسان دنیا کے کھلونوں کو حقیقی سمجھنے لگا ہے۔ روپے پیسے کے تئیں آج کے انسان کی غیر معمولی دلچسپی پر اظہار خیال کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں

"کیونکہ کھلونا ابتدا میں بھی کھلونا تھا اور درمیان میں بھی محض کھلونا ہی رہے گا جبکہ روپیہ ابتدا میں ذریعہ تھا لیکن اب کھلونا بن گیا ہے" [3]

یہاں ایک عجیب بات سامنے آتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وزیر آغا کھلونے کو مسرت کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے مسرت کی حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں لیکن جہاں تک پرانے زمانے کے کھلونوں اور آج کے کھلونوں کا ذکر کرنے میں روپیہ کو تقابلی مطالعہ میں پرانے زمانے کے کھلونوں پر انہوں نے جو تلاش کی ہے کہ ان سے بچوں کی ذہانت بھی سامنے آتی تھی جبکہ آج کل کے کھلونے ذہین بچے کو تماشائی کی حیثیت رکھنے میں اپنا ... ان کا کوئی رول نہیں ہوتا

مندرجہ بالا نمائندہ انشائیوں کے تجزیے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وزیر آغا نے اپنی انشائیہ نگاری کے ذریعے اس صنف انشائیہ کو کس بلند مقام پر پہنچایا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ کے فن پر غور و خوض کرنے کے ساتھ وزیر آغا نے تخلیقی سطح پر اس صنف کا استعمال کر کے اپنے نظریات اور تصورات کو عملی شکل بھی دی ہے۔

---

۱ سمندر اگر میرے اندر گرے وزیر آغا کھلونے صفحہ ۵۵
۲ " " " " ۵۵
۳ " " " " ۶۰

کتابیات

کتابیات

	کتاب کا نام	مصنف کا نام	مطبع	سن اشاعت
(۱)	انشائیہ اور انشائیے	سید محمد حسنین	ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ)	۱۹۹۰ء
(۲)	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ	وانٹر پریس اسپورٹم (بمبئی)	۱۹۶۵ء
(۳)	انشائیہ کی بنیاد	سلیم اختر	مشان ہند پبلی کیشنز دریا گنج (دہلی)	۱۹۸۸ء
(۴)	افادات مہدی	مہدی افادی	معارف پریس اعظم گڑھ	۱۹۴۹ء
(۵)	انتخاب مہدی افادی	ڈاکٹر فیروز احمد	یو پی اردو اکیڈمی لکھنؤ	
(۶)	ادلستان	خلیقی دہلوی	مسلم پرنٹنگ پریس لاہور	۱۹۳۰ء
(۷)	انشائیہ کے خدوخال	ڈاکٹر وزیر آغا	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۹۱ء
(۸)	انتخاب رشید احمد صدیقی	شہاب الدین ثاقب	یو پی اردو اکیڈمی	
(۹)	اردو انشائیہ	سید صفی مرتضیٰ	نسیم بک ڈپو نظامی پریس (لکھنؤ)	۱۹۶۱ء
(۱۰)	انشائیے	فضل احمد صدیقی	ڈائرکٹر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ناظم آباد (کراچی)	۱۹۶۷ء
(۱۱)	تنقید اور احتساب	ڈاکٹر وزیر آغا	علی بک ڈپو شمشاد مارکیٹ (علی گڑھ)	۱۹۷۶ء
(۱۲)	تذکرہ	ابوالکلام آزاد	انارکلی کتاب گھر (لاہور)	۱۹۱۹ء
(۱۳)	پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	اعجاز پبلشنگ ہاؤس (دہلی)	۱۹۹۲ء
(۱۴)	چوری سے یاری تک	ڈاکٹر وزیر آغا	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج دہلی	۱۹۸۲ء
(۱۵)	دوسرا کنارا	ڈاکٹر وزیر آغا	سیمانت پرکاشن (دہلی)	۱۹۸۵

(۱۶)	چراغ تلے	مشتاق احمد یوسفی	گولڈن پریس حیدرآباد	۱۹۸۴
(۱۷)	خیال پارے	ڈاکٹر وزیر آغا	مکتبہ اردو زبان سرگودھا	۱۹۸۴
(۱۸)	خیالستان	سجاد حیدر یلدرم	اردو بازار لاہور	۱۹۶۷
(۱۹)	خنداں	رشید احمد صدیقی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۱۹۸۸
(۲۰)	خاکم بدہن	مشتاق احمد یوسفی	گولڈن پریس حیدرآباد	۱۹۷۳
(۲۱)	زرگزشت	مشتاق احمد یوسفی	جواہر آفسیٹ پرنٹرس دہلی	۱۹۷۷ء
(۲۲)	سمندر اگر میرے اندر	ڈاکٹر وزیر آغا	مکتبۂ خیال (لاہور)	۱۹۸۹ء
(۲۳)	سی پارۂ دل (حصہ اول)	خواجہ حسن نظامی	خواجہ اولاد کتاب گھر	۱۹۶۵
(۲۴)	سنگ و خشت	کنہیا لال کپور	مکتبہ جدید لاہور	
(۲۵)	شیریں کی خاطر	پروفیسر نظیر صدیقی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۱ء
(۲۶)	شیشہ و تیشہ	کنہیا لال کپور	دہلی	۱۹۴۴ء
(۲۷)	ماسٹر رام چندر اور اردو نثر میں ان کا حصہ	ڈاکٹر سیدہ جعفر	اورینٹل انسٹیٹیوٹ (حیدرآباد)	۱۹۶۰
(۲۸)	ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمان قدوائی	اجمی پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۶۱ء
(۲۹)	مقالات سرسید حصہ دوئم (مرتبہ)	مولانا اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۲
(۳۰)	محشر خیال	سجاد انصاری	اردو مرکز انارکلی لاہور	۱۹۵۷ء
(۳۱)	مضامین فرحت حصہ دوئم	فرحت اللہ بیگ	کلیان پبلشرز گنج لکھنؤ	۱۹۵۹
(۳۲)	مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۸۶ء
(۳۳)	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	سرفراز قومی پریس لکھنؤ	۱۹۵۸
(۳۴)	نگارستان	نیاز فتحپوری	نسیم بکڈپو لکھنؤ	۱۹۸۳
(۳۵)	نشاط خاطر	حسین عظیم آبادی	دائرہ ادبی رتاج آفسیٹ الٰہ آباد	۱۹۸۰
(۳۶)	وزیر آغا (ایک مطالعہ)	ڈاکٹر انور سدید	مکتبہ اسلوب کراچی	۱۹۸۳

رسائل

۱	اوراق	(افسانہ انشائیہ نمبر)	دفتر اوراق اردو بازار لاہور	مارچ اپریل	۱۹۷۲ء
۲	ادیب	(انشائیہ نمبر)	سرسید بک ڈپو علی گڑھ	مئی	۱۹۵۹ء
۳	اوراق	(خاص شمارہ ۳ جلد ۳)	دفتر اوراق اردو بازار لاہور		۱۹۶۸ء
۴	اوراق	جلد ۱۷	״	اپریل مئی	۱۹۸۲ء
۵	اوراق	شمارہ ۶-۵ جلد ۲۷	دفتر اوراق ۱۱۵/م سرور روڈ لاہور	جون جولائی	۱۹۹۲ء
۶	اوراق	خاص شمارہ ۹ جلد ۱			۱۹۶۶ء
۷	اوراق	شمارہ ۲-۱ جلد ۱۳	دفتر اوراق، اردو بازار، لاہور	جنوری فروری	۱۹۷۹ء
۸	اوراق	خاص نمبر شمارہ ۶ جلد ۲۶	״ ״	جون جولائی	۱۹۹۱ء
۹	اوراق	خاص نمبر شمارہ ۶-۵ جلد ۲۸	مکتبہ جدید پریس لاہور	مئی جون	۱۹۹۳ء
۱۰	دلگداز	عبدالحلیم شرر	مرکنٹائل پریس لاہور	اگست	۱۸۸۷ء
۱۱	شاعر	شمارہ ۲ جلد ۶۶	ماہنامہ شاعر مکتبہ سینٹرل پوسٹ آفس بمبئی		۱۹۹۵ء
۱۲	نقوش	شمارہ ۱۰۴	لاہور		